بسم اللہ الرحمن الرحیم

وحدت امت کا داعی اور غلبہ اسلام کا علم بردار

# ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ

جلد:۲۶ ○ شمارہ:۹ ○ ستمبر ۲۰۱۵ء

بیاد
شیخ الحدیث حضرت مولانا
محمد سرفراز خان صفدرؒ

شیخ التفسیر حضرت مولانا
صوفی عبد الحمید سواتیؒ

رئیس التحریر
ابو عمار زاہد الراشدی

مدیر
محمد عمار خان ناصر

مجلس تحریر
پروفیسر غلام رسول عدیم
میاں انعام الرحمٰن
ڈاکٹر محمد اکرم ورک
محمد یوسف ایڈووکیٹ
شبیر احمد خان میواتی

انتظامیہ
ناصر الدین خان عامر
عبد الرزاق خان
حافظ محمد طاہر

کلمہ حق

ملا محمد عمرؒ / مولانا قاضی عبد الکریمؒ / جنرل حمید گلؒ — رئیس التحریر — ۲

آرا وافکار

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر۔۱۱ — ڈاکٹر محی الدین غازی — ۸

خاطرات — محمد عمار خان ناصر — ۱۳

حالات وواقعات

بچوں کے ساتھ جنسی بدسلوکی اور اس کا سد باب — محمد فیصل شہزاد — ۱۸

دعوت دین اور ہمارے معاشرتی رویے — محمد اظہار الحق — ۲۶

جانباز مرزا..... عظیم مرزا — محمد سلیمان کھوکھر — ۲۹

مباحثہ ومکالمہ

امام ابن جریر طبری کی مظلومیت — مولانا عبد المتین منیری — ۳۱

غامدی فکر ومنہج ائمہ سلف کے فکر ومنہج کے مطابق ہے؟ ۸ — حافظ صلاح الدین یوسف — ۴۰

مکاتیب — محمد مشتاق احمد / انور عباسی — ۴۷

اخبار واثار

سید احمد شہیدؒ پر ایک بین الاقوامی کانفرنس کا احوال — مولانا حافظ محمد رشید — ۵۱

| زر تعاون | خط کتابت کے لیے | زیر اہتمام | شعبہ ترسیل |
|---|---|---|---|
| سالانہ 300 روپے | ماہنامہ الشریعہ | الشریعہ اکادمی | مکتبہ امام اہل سنت |
| بیرون ملک سے | پوسٹ بکس 331 گوجرانوالہ | ہاشمی کالونی کنگنی والا گوجرانوالہ | جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ |
| 25 امریکی ڈالر | aknasir2003@yahoo.com | www.alsharia.org | 0306-6426001 |

ناشر: حافظ محمد عبد المتین خان زاہد ۔ طابع: مسعود اختر پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور

**کلمہ حق**

# ملا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال

گزشتہ ماہ کے دوران افغان طالبان کی طرف سے اس خبر کی تصدیق کر دی گئی کہ ان کے امیر ملا محمد عمر مجاہد کا انتقال ہو گیا ہے (انا للہ وانا الیہ راجعون) اور طالبان شوریٰ نے ان کے نائب ملا اختر منصور کو ان کی جگہ نیا امیر چن لیا ہے۔

ملا محمد عمرؒ روسی استعمار کے خلاف افغان جہاد میں شریک رہے ہیں، اس میں زخمی بھی ہوئے تھے اور ان کی ایک آنکھ متاثر ہو گئی تھی۔ لیکن وہ گمنامی کے اندھیروں میں اس وقت ایک چمکدار ستارے کی مانند نمودار ہوئے جب سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی کے بعد افغانستان بین الاقوامی طاقتوں کی طے شدہ پالیسی کے مطابق ایک نئی اور وسیع تر خانہ جنگی کا شکار ہو چکا تھا۔ کابل پر قبضے کی بڑی جنگ کے ساتھ ساتھ افغان مجاہدین اور تحلیل شدہ سابقہ سرکاری افغان فوج کے مختلف گروپ افغانستان کے بہت سے علاقوں میں باہم برسر پیکار تھے۔ پورا افغانستان افراتفری کا شکار تھا، سرداروں کی اس جنگ (لارڈز وار) نے افغانستان کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا دیا تھا اور شاید بہت سی بڑی طاقتیں بھی یہی چاہتی تھیں۔ مگر قندھار کے ایک گمنام طالب علم نے اپنے طالب علم ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور افغان عوام کو لارڈز وار کی نحوست سے نجات دلانے اور جہاد افغانستان کے نظریاتی مقاصد کی تکمیل یعنی نفاذ شریعت کو اپنا مقصد قرار دے کر یہ بے سروسامان طلبہ میدان میں نکل آئے۔ ان کا ابتدائی ہدف یہ تھا کہ کوئٹہ سے قندھار اور پھر مزار شریف تک کے تجارتی راستے پر علاقائی سرداروں نے جگہ جگہ ناکے لگا کر جبری ٹیکس وصول کرنے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا تھا اسے ختم کر کے تجارتی گزرگاہ کو محفوظ بنایا جائے۔ چونکہ ابتدائی لشکر کے زیادہ تر شرکاء دینی مدارس کے طلبہ تھے جو جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے مختلف جہادی گروپوں سے تعلق رکھتے تھے اس لیے یہ لشکر طالبان کے نام سے معروف ہوا۔ اور پھر چند سو افراد سے شروع ہونے والا یہ لشکر رفتہ رفتہ ایک منظم فوج کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ انہوں نے نہ صرف تجارتی راستہ صاف کیا بلکہ جو علاقے ان کے کنٹرول میں آتے گئے وہاں شریعت اسلامیہ کے مطابق امارتی نظام قائم کر کے افغان عوام کو اسلامی قوانین کی برکات سے فیض یاب کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا جس کا مشاہدہ و اعتراف ملا محمد عمرؒ کے پانچ سالہ دور حکومت میں عالمی سطح پر بھی کیا جاتا رہا۔ انہوں نے اپنی حکومت کو ''امارت اسلامی افغانستان'' کا نام دیا اور دھیرے دھیرے کابل سمیت بیشتر افغانستان پر کنٹرول حاصل کر لیا۔

ملا محمد عمرؒ کی حکومت کے تین کارناموں کا آج بھی بین الاقوامی سطح پر اعتراف کیا جاتا ہے۔

☆ لارڈز وار کا خاتمہ یعنی سرداروں کی ان علاقائی حکومتوں اور باہمی جنگوں کا خاتمہ جس کا عام حالات میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

☆ انہوں نے اپنے زیر کنٹرول علاقوں میں عام افغان آبادی کو غیر مسلح کر دیا، یعنی ہر شخص سے اسلحہ واپس لے کر افغانستان جیسے ملک میں ''ویپن لیس سوسائٹی'' کا عملی نمونہ پیش کیا۔

☆ ہیروئن بنانے والے پوست کی کاشت جو طالبان کے دور سے پہلے کبھی کنٹرول ہوئی اور نہ ہی ان کی حکومت کے خاتمہ کے بعد سے اب تک ممکن ہو سکی ہے، بین الاقوامی رپورٹوں کے مطابق ملا محمد عمرؒ کے ایک حکم سے ایسے ختم ہوئی کہ ان کے حکومتی دائرہ میں شامل علاقوں میں ایک پودا بھی کاشت نہ ہونے کا محاورہ بولا جانے لگا۔

یہ تو وہ باتیں ہیں جو بین الاقوامی اداروں کی رپورٹوں کا حصہ ہیں اور ان کا عالمی سطح پر اعتراف کیا گیا ہے، جبکہ ہمارے نزدیک ان کے ساتھ ان امور کو شامل کرنا بھی ضروری ہے۔

☆ شرعی احکام وقوانین کا عملی نفاذ اور عوام کو شریعت اسلامیہ کے مطابق انصاف کی فراہمی۔

☆ گڈ گورننس اور سادہ وفطری انداز حکمرانی کا ایسا نمونہ کہ بلاشبہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی یاد تازہ ہو گئی۔

☆ امن عامہ اور لوگوں کی جان و مال اور آبرو کا اس درجہ میں تحفظ کہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے کابل کے بازاروں میں دکانداروں کو دکانیں کھلی چھوڑ کر نماز کے لیے مسجد میں جاتے دیکھا ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں ایک ذاتی واقعہ کبھی نہ بھولے گا کہ ایک بار میں چند روز کے لیے کابل گیا ہوا تھا۔ پل خشتی کی جامع مسجد میں نماز ادا کرنے کے بعد بازار کی طرف نکلا تو چند سکھوں کی دکانیں دکھائی دیں۔ میں ایک دکان میں بلا تکلف گھس گیا اور ٹھیٹھ پنجابی زبان میں جب دکاندار کا حال احوال دریافت کیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ کچھ دیر ہمارے درمیان گفتگو رہی، میں نے اس سے پوچھا کہ سردار جی! یہ مولوی جب سے آئے ہیں آپ کیا تبدیلی دیکھ رہے ہیں؟ اس نے بے تکلفی سے کہا کہ جب سے یہ مولوی آئے ہیں ہم آرام کی نیند سوتے ہیں۔ میں نے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا کہ پہلے ہر وقت خوف و ہراس کی کیفیت رہتی تھی، میرے دو بیٹے جوان ہیں، ہم تینوں باری باری آٹھ آٹھ گھنٹے پہرہ دیتے تھے، اور باقی گھر والے سوتے تھے۔ جب سے ان مولویوں کی حکومت آئی ہے ''ایہہ مولبی پہرہ دیندے آ، تے اسی سکھ دی نیند سوندے ہاں''۔ یہ مولوی پہرہ دیتے ہیں اور ہم آرام کی نیند سوتے ہیں۔

مجھے کابل اور قندھار دونوں جگہ ملا محمد عمرؒ سے ملاقات وگفتگو کا موقع ملا ہے اور طالبان حکومت کے متعدد راہ نماؤں سے تفصیلی ملاقاتیں ہوئی ہیں جن کے کچھ تاثرات اپنے بیسیوں کالموں میں وقتاً فوقتاً قارئین کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں، جبکہ اکثر حصہ ابھی ''در بطن شاعر'' کی کیفیت میں ہے۔

''الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ'' نے اس سال پندرہ روزہ فکری نشستوں میں میری گفتگو کا عنوان ''میری یادداشتیں'' طے کیا ہے جس کے تحت سال کے دوران ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ مجالس میں اپنی جماعتی، مسلکی اور تحریکی سرگرمیوں کی

یادداشتیں بشرط صحت وتوفیق بیان کروں گا، اورانہیں ریکارڈ کرنے کے بعد قلمبند کرنے کا بھی پروگرام ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ میں نے اس میں ''جہاد افغانستان'' سے متعلقہ یادداشتوں کو ترجیحاً پہلے بیان کرنے کا ارادہ کیا ہے، اس لیے کہ روس کے خلاف جہاد افغانستان کے آغاز سے طالبان حکومت کے خاتمہ تک بحمد اللہ تعالیٰ کم وبیش ہر مرحلہ میں شریک رہا ہوں، جس کے مشاہدات وتاثرات بلاشبہ قوم اور تاریخ کی امانت ہیں۔ قارئین سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ رب العزت مجھے یہ امانت پوری دیانت اور شرح صدر کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

ان گزارشات کے بعد امیر المومنین حضرت ملا محمد عمر مجاہدؒ کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے ان کے رفقاء اور اہل خانہ کے ساتھ اس غم میں شریک ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور ان کے رفقاء ومتوسلین کو صبر وحوصلہ کے ساتھ ان کا مشن جاری رکھنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

## مولانا قاضی عبد الکریم آف کلاچی کا سانحہ ارتحال

حضرت مولانا قاضی عبد الکریم آف کلاچیؒ کا انتقال علمی ودینی حلقوں کے لیے غم وصدمہ کا باعث ہے اور بلاشبہ ہم ایک مخلص بزرگ اور مدبر راہ نما سے محروم ہو گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے والد گرامی حضرت مولانا قاضی نجم الدین کلاچویؒ اپنے دور کے بڑے علماء کرام میں سے تھے اور علمی ودینی دنیا میں مرجع کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے فتاوٰی ''نجم الفتاوٰی'' کے عنوان سے کتابی شکل میں موجود ہیں اور علماء کرام کے لیے راہ نمائی اور استفادہ کا اہم ذریعہ ہیں۔

حضرت مولانا قاضی عبد الکریمؒ دار العلوم دیوبند کے پرانے فضلاء میں سے تھے۔ انہوں نے غالباً 1938ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا تلمذ حاصل کر کے دورۂ حدیث کیا تھا، جبکہ ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا قاضی عبد اللطیفؒ 1942ء میں دورۂ حدیث میں شریک ہوئے تھے اور اسی سال میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے بھی فراغت حاصل کی تھی۔

میں نے دونوں بھائیوں کو 1970ء کے عام انتخابات کے دوران پہلی بار جمعیۃ علماء اسلام میں متحرک دیکھا تھا جو میرا ابتدائی دور تھا۔ اور یہ دونوں بزرگ جمعیۃ کے اہم راہنماؤں اور مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے قریبی رفقاء میں شمار ہوتے تھے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقہ میں حضرت مولانا علاء الدینؒ، حضرت مولانا قاضی عبد الکریمؒ، حضرت مولانا قاضی عبد اللطیفؒ، حضرت مولانا قاضی عطاء اللہ آف ٹانکؒ، حضرت مولانا مفتی عبد القدوسؒ اس وقت کے بڑے جماعتی بزرگ شمار ہوتے تھے اور ان سب سے میری نیاز مندی ایک کارکن کے طور پر اس وقت سے قائم تھی۔ ڈیرہ اسماعیل خان اور کلاچی اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ جمعیۃ کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاسوں میں بھی ان سے ملاقات ہوتی تھی اور جماعتی امور میں نیاز مندانہ رفاقت کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ مولانا قاضی عبد الکریمؒ نکتہ رس اور صاحب الرائے بزرگ تھے اور علمی وسیاسی اجلاسوں میں ان کی رائے ہمیشہ وقیع ہوتی تھی جسے توجہ سے سنا جاتا تھا۔ ایک عرصہ تک وہ جمعیۃ کے مرکزی اجلاسوں کا لازمی حصہ رہے مگر بعد میں بوجوہ غیر متحرک ہوتے چلے گئے۔ شاید اس کی

ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے چھوٹے بھائی مولانا قاضی عبداللطیفؒ جمعیۃ کی مرکزی قیادت کا متحرک حصہ بن گئے تھے اور بڑے بھائی ہر اجلاس میں شرکت کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ جبکہ مولانا قاضی عبداللطیفؒ کو حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے رفقاء میں سینئر معاون کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور وہ جماعتی سیاست کے ساتھ ساتھ بعد میں پارلیمانی سیاست کا بھی اہم کردار بن گئے تھے۔ بالخصوص حضرت مولانا سمیع الحق کے ساتھ سینٹ میں شریعت بل پیش کرنے پر انہیں ملک گیر شہرت حاصل ہوئی تھی۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کے وقت مرکزی ناظم کے طور پر ان کے نائبین میں حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ، حضرت مولانا قاضی عبداللطیفؒ، حضرت مولانا غلام ربانیؒ آف رحیم یار خان، حضرت مولانا نیاز محمدؒ آف زیارت بلوچستان، اور راقم الحروف متحرک تھے۔

مولانا قاضی عبدالکریمؒ بعض علمی امور پر اپنی منفرد رائے رکھتے تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اسمبلی میں غیر مسلموں کی نمائندگی کے حق میں نہیں تھے، ان سے اس مسئلہ میں متعدد بار میری بھی گفتگو ہوئی۔ ان کا موقف تھا کہ ایک اسلامی ریاست کی پارلیمنٹ میں کسی غیر مسلم کی موجودگی کا کوئی جواز نہیں ہے، جبکہ ہمارا موقف یہ تھا کہ غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق ومفادات کے تحفظ کے لیے غیر مسلموں کو اسمبلی میں نمائندگی دی جا سکتی ہے۔

افغانستان میں طالبان حکومت کے دوران میں نے ایک موقع پر رائے دی کہ طالبان راہ نماؤں کو اسلامی ریاست کے سیاسی ڈھانچے کی تشکیل کے لیے پاکستان میں نفاذ اسلام کے حوالہ سے علماء کرام کی علمی وفکری جدوجہد اور اس سلسلہ میں سرگرم سرکردہ علماء کرام کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اور علمی وفکری محاذ کے ہوم ورک سے استفادہ کرنا چاہیے۔ خاص طور پر علماء کے 22 نکات اور 1973ء کے دستور کی اسلامی دفعات کو اپنے ہاں دستوری بنیاد بنانا چاہیے۔ میں اس رائے پر اب بھی قائم ہوں اور اس کا اظہار کرتا رہتا ہوں، مگر ایک بار میں نے اس رائے کا تفصیل کے ساتھ کسی مضمون میں اظہار کیا تو مولانا قاضی عبدالکریمؒ نے ایک مکتوب گرامی میں فرمایا کہ ’’کیوں طالبان قائدین کو بھی ہمارے جیسی عادتیں ڈالنا چاہتے ہو‘‘۔ سچی بات ہے کہ اپنے موقف پر اصولی طور پر قائم رہتے ہوئے بھی مجھے حضرت قاضی صاحبؒ کی یہ پرخلوص بات اپیل کر گئی اور میں اپنی رائے کے اظہار میں محتاط ہو گیا۔

حضرت مولانا قاضی عبدالکریمؒ ان بزرگوں میں سے تھے جو علم وحکمت کے ساتھ فکر ودانش سے بھی پوری طرح بہرہ ور تھے اور حالات حاضرہ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ میں نے کئی بار کلاچی میں ان کی خدمت میں حاضری دی ہے اور علمی وفکری استفادہ کے ساتھ ان کی شفقتوں اور دعاؤں سے ہمیشہ فیض یاب ہوا ہوں۔ اللہ رب العزت ان کے درجات جنت میں بلند فرمائیں اور برادرم مولانا قاضی محمد نسیم کلاچوی اور دیگر رفقاً، تلامذہ اور اہل خاندان کو صبر وحوصلہ کے ساتھ یہ عظیم صدمہ برداشت کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

## جنرل حمید گل بھی رخصت ہوئے

جنرل حمید گل مرحوم آج ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی تاریخی جدوجہد اور تگ ودو کے اثرات ایک عرصہ تک

تاریخ کے صفحات پر جگمگاتے رہیں گے۔ ان کا تعلق پاک فوج سے تھا اور ان کا نام جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم اور جنرل اختر عبدالرحمٰن مرحوم کے ساتھ جہادِ افغانستان کے منصوبہ سازوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ جہاد افغانستان جس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا اور جس کے مثبت و منفی دونوں قسم کے اثرات سے پوری دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے یا انہیں بھگت رہی ہے۔

جنرل حمید گل مرحوم کا اس جنگ میں کیا کردار تھا؟ اس کے اظہار کا ایک پہلو یہ ہے کہ جہاد افغانستان کے نتیجے میں سوویت یونین ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی جس کی وجہ سے جرمنی متحد ہوا اور برلن کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والی دیوار توڑ دی گئی، تو زندہ دل جرمنوں نے اس کا ایک چھوٹا سا پتھر جنرل حمید گل مرحوم کو بھی اس نوٹ کے ساتھ بھجوایا کہ یہ دیوار چونکہ آپ کی کوششوں سے ٹوٹی ہے اس لیے یادگار اور اعتراف کے طور پر اس ٹوٹی ہوئی دیوار کا ایک پتھر آپ کو بھجوایا جا رہا ہے۔

جہاد افغانستان کی برکت سے نہ صرف جرمنی متحد ہوا بلکہ مشرقی یورپ کو کمیونزم کے تسلط سے نجات ملی، وسی ایشیا کی ریاستیں آزاد ہوئیں اور بالٹیک ریاستوں نے بھی آزادی کا ماحول پایا۔ مگر اسے تاریخ کی ستم ظریفی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جہاد افغانستان میں فیصلہ کن کردار ادا کرنے والے افغان مجاہدین اپنے ہی ملک میں ایک بار پھر غیر ملکی جارحیت سے نبرد آزما ہیں اور ان کی مدد کے لیے دنیا بھر سے آئے ہوئے مجاہدین اپنے اپنے ملکوں میں ''دہشت گرد'' کا خطاب پا کر خود اپنی حکومتوں کے جبر کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

جنرل حمید گل مرحوم کو جہاد افغانستان کے ہیروز میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ اگر صرف اسی اعزاز کو سینے سے لگائے دنیا سے رخصت ہو جاتے تو تاریخ میں ان کا نام زندہ رہنے کے لیے یہ بات کافی تھی۔ مگر ان کا ہدف صرف تاریخ میں اپنے نام کو محفوظ کرنا نہیں تھا بلکہ وہ خود کو اللہ کا سپاہی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جاں نثار، اسلام کا خدمت گزار، ملت اسلامیہ کا غم خوار اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نظریاتی کارکن سمجھتے تھے۔ اس لیے زندہ دل جرمنوں سے ''خراج کا پتھر'' وصول کرنے کے بعد ان کے قدم رکے نہیں بلکہ وہ آگے بڑھتے چلے گئے اور انہوں نے جہاد افغانستان کے نظریاتی مقاصد کے حصول، پاکستان کو ایک صحیح اسلامی ریاست کی شکل دینے اور عالم اسلام کی دینی تحریکات کے دفاع اور انہیں سپورٹ کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا اور اسی راہ میں جدوجہد کرتے ہوئے اپنے اللہ کے حضور جا پہنچے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

انہیں جہاد افغانستان کا منصوبہ ساز کہا جاتا ہے اور اس کے بعد انہیں پاکستان میں اسلامی جمہوری اتحاد (IJI) کا خالق بھی بتایا جاتا ہے جبکہ افغانستان و پاکستان کے حوالہ سے بہت سی تحریکات کے راہ نماؤں میں وہ صف اول میں دیکھے جاتے رہے ہیں۔ ان کے طریق کار، سوچ اور اقدامات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا اسلام کی خاطر کیا، ملت اسلامیہ کا مفاد سمجھ کر کیا اور اسلامی جمہوری پاکستان کی خدمت کے جذبہ کے ساتھ کیا۔

میں بھی چونکہ اسی راہ کا مسافر ہوں اور اس سفر میں صحرا نوردی کرتے ہوئے مجھے نصف صدی کا عرصہ بیت چکا ہے اس لیے جنرل حمید گل مرحوم کے ساتھ رفاقت، ہم آہنگی اور یگانگت فطری بات ہے اور یہ مختلف دائروں میں مسلسل رہی ہے۔ ملاقاتیں بھی رہی ہیں، مشاورت کا سلسلہ بھی وقفہ وقفہ سے موجود رہا ہے، متعدد تحریکات میں شرکت بھی رہی ہے،

اور اہم قومی و دینی مسائل پر مشترکہ موقف کے اظہار کے لیے باہمی تبادلۂ خیالات کے مواقع بھی میسر رہے ہیں۔ جب اکوڑہ خٹک میں افغانستان اور پاکستان کے دفاع کے لیے قومی سطح پر دینی و سیاسی جماعتوں کا بہت بڑا کنونشن حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ کی صدارت میں ہوا تھا اور دفاع پاکستان و افغانستان کونسل کی تشکیل عمل میں لائی گئی تھی تو کنونشن کا موقف تحریر کرنے کی ذمہ داری جنرل حمید گل مرحوم اور راقم الحروف کو سونپی گئی تھی۔ ہم دونوں جب اس مقصد کے لیے تنہا ہوئے تو جنرل صاحب نے کہا کہ مولانا! آپ ہی لکھیں، میں اس پر نظر ثانی کر لوں گا۔ چنانچہ ہم دونوں نے اس طرح اس کنونشن کا اعلامیہ مرتب کیا اور اس کی بنیاد پر ایک نئی قومی کونسل وجود میں آئی۔

جرنل صاحب آئی ایس آئی کے سربراہ تھے، انہیں اس منصب سے تبدیل کر کے جب ایک ٹیکنیکل قسم کا منصب دیا گیا تو وہ مستعفی ہو گئے۔ مجھے ان کے اس فیصلے سے اتفاق نہیں تھا اس لیے کہ سنیارٹی کی فہرست میں ایک دو ٹرم کے بعد ان کے چیف آف آرمی اسٹاف بننے کا چانس دکھائی دے رہا تھا۔ مگر وہ استعفیٰ دے چکے تھے اس لیے اب کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ تحریک انصاف ابھی وجود میں نہیں آئی تھی اور ایم کیو ایم کے ساتھ ان کا کوئی مثبت تعلق نہیں تھا، جبکہ ان کے استعفیٰ پر سیاست کی اکاس بیل کا سایہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ مستعفی ہوئے تو ہو ہی گئے البتہ بعد میں جب ہمارے خیال کے مطابق اس ''چانس'' کا مرحلہ گزر گیا تو میں نے ایک ملاقات میں ان سے کہا کہ

''جنرل صاحب! اب آپ کو اپنے غصے پر غصہ تو آ رہا ہوگا۔''

جنرل صاحب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بات کا رخ کسی اور طرف موڑ دیا۔ جرنل صاحب نظریاتی اور فکری دنیا کے بھی جنرل تھے۔ عالمی تاریخ اور بین الاقوامی معاملات کے اتار چڑھاؤ کو سمجھتے تھے، بروقت بات کہنے کا ذوق رکھتے تھے اور لگی لپٹی رکھے بغیر منہ پر بات کرنے کا حوصلہ بھی ان میں موجود تھا۔ لاہور کے فلیٹی ہوٹل میں ایک سیمینار تھا جس میں جسٹس سید نسیم حسن شاہ مرحوم نے قرآن و سنت کی بالادستی پر بڑی اچھی گفتگو کی۔ راقم الحروف بھی اس میں شریک تھا۔ جسٹس صاحب مرحوم کے بعد جب جنرل حمید گل مرحوم نے گفتگو کی تو جسٹس مرحوم سے مخاطب ہو کر کہا کہ جناب والا! جب آپ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے طور پر ''قرارداد مقاصد'' کو دستور کی بالادست دفعہ تسلیم نہ کرنے کا فیصلہ تحریر فرما رہے تھے تو قرآن و سنت کی بالادستی پر آپ کا یہ عقیدہ کونسے فریزر میں منجمد پڑا تھا جس کا آپ نے آج کے خطاب میں اظہار کیا ہے؟ جنرل حمید گل مرحوم کے اس استفسار پر جسٹس صاحب مرحوم نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا اور میرے دل نے بے ساختہ دعائیں دینا شروع کر دیں۔

جنرل حمید گل مرحوم کی جدائی سے ہم اسلامی جمہوریہ پاکستان کی نظریاتی شناخت کے تحفظ اور ''اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام'' کی جدوجہد کے ایک عظیم جرنیل سے محروم ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں انہیں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور پسماندگان کو صبر و حوصلہ کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

---

**آرا وافکار**

ڈاکٹر محی الدین غازی*

# اردو تراجم قرآن پر ایک نظر

## مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں-۱۱

### (۶۸) مَقام اور مُقام میں فرق

مَـقَـام (میم پر زبر کے ساتھ) کی اصل قیام ہے، یہ فعل قـام ثلاثی مجرد لازم سے اسم ظرف ہوتا ہے یا مصدر میمی ہوتا ہے۔مُـقَـام (میم پر پیش کے ساتھ) کی اصل اقامة ہے، یہ فعل أَقَامَ کا ظرف ہوتا ہے یا مصدر میمی یا اسم مفعول ہوتا ہے۔ قیـام کا صلہ اگر باء ہو تو اس کے معنی کسی کام کو کرنا یا کسی سرگرمی کو انجام دینا ہوتا ہے، جبکہ اقـامة اگر فی کے صلے کے ساتھ لازم ہو تو اس کے معنی کسی جگہ رہائش اختیار کرنا ہے۔اور اگر مفعول بہ مراد ہو تو متعدی ہوتا ہے جیسے أقام الدین اور فأقامه۔

اس وضاحت کی روشنی میں لفظ مَقام اور لفظ مُقام کے مفہوم میں فرق واضح ہوتا ہے، لفظ مَقام کا مطلب سرگرمی ہوگا یا سرگرمی سے انجام دینے کی جگہ یا مطلق حالت، جبکہ لفظ مُقام کا مطلب رہائش یا رہائش کی جگہ ہوگا۔گویا مَقام کے معنی رہائش گاہ کے نہیں ہوں گے، جبکہ مُقام کے معنی رہائش گاہ کے ہوں گے۔

دونوں لفظوں کے اس فرق کی وضاحت کے بعد ہم جائزہ لیں گے کہ قرآن مجید کے مترجمین نے اس فرق کی کس حد تک رعایت کی۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْناً وَاتَّخِذُواْ مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى۔ (البقرۃ:۱۲۵)

''اور (یاد کرو) جبکہ ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے مرکز اور امن کی جگہ بنایا اور (حکم دیا کہ) مسکن ابراہیم میں ایک نماز کی جگہ بناؤ''۔(امین احسن اصلاحی، مَقام کا ترجمہ مسکن درست نہیں ہے۔)

''اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبے) کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیمؑ جہاں عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اس مقام کو مستقل جائے نماز بنالو''۔(سید مودودی)

''اور (یاد کرو) جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لئے مرجع اور امان بنایا اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام بناؤ''۔(احمد رضا خان)

---

*ہیڈ آف ریسرچ، دار الشریعۃ متحدہ عرب امارات۔mohiuddin.ghazi@gmail.com

**فِيْهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيْمَ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِناً۔** (آل عمران:۹۷)

''وہاں واضح نشانیاں ہیں: مسکن ابراہیم ہے۔ جو اس میں داخل ہوجائے وہ مامون ہے''۔ (امین احسن اصلاحی، **مَقَام** کا ترجمہ مسکن درست نہیں ہے۔)

''اس میں کھلی نشانیاں ہیں (ان میں سے ایک) ابراہیم (علیہ السلام) کی جائے قیام ہے، اور جو اس میں داخل ہوگیا امان پا گیا''۔ (طاہر القادری، **مَقَام** کا ترجمہ جائے قیام بھی درست نہیں ہے۔)

''اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیمؑ کا مقام عبادت ہے، اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہوگیا''۔ (سید مودودی)

مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں مولانا امانت اللہ اصلاحی نے **مَقَام ابراھیم** کا ترجمہ ''ابراہیم کی سرگرمیوں اور جدوجہد کا مرکز'' کیا ہے۔ اس ترجمہ سے مکہ کی اس پہلو سے خصوصیت واضح ہوجاتی ہے۔

**وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ۔ وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّونَ۔ وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُون۔** (الصافات:۱۶۴-۱۶۶)

''(فرشتوں کا قول ہے کہ) ہم میں سے تو ہر ایک کی جگہ مقرر ہے، اور ہم تو (بندگیٔ الٰہی میں) صف بستہ کھڑے ہیں اور اس کی تسبیح بیان کر رہے ہیں''۔ (محمد جوناگڈھی)

''اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا ایک مقام مقرر ہے، اور ہم صف بستہ خدمت گار ہیں، اور تسبیح کرنے والے ہیں''۔ (سید مودودی)

مولانا امانت اللہ اصلاحی نے ترجمہ کیا:

''اور ہم میں سے ہر ایک کے لئے ایک متعین ذمہ داری ہے، اور ہم تو خدا کے حضور صف بستہ رہنے والے ہیں، اور ہم تو اس کی تسبیح کرتے رہنے والے ہیں''۔

اس سلسلے میں اسی سورہ کے آغاز کی آیتیں بھی سامنے رہیں، تو نظم قرآن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بڑی دلچسپ بات سامنے آتی ہے۔

**وَالصَّافَّاتِ صَفّاً۔ فَالزَّاجِرَاتِ زَجْراً۔ فَالتَّالِيَاتِ ذِكْراً۔** (الصافات:۱-۳)

ترجمہ ہے: ''شاہد ہیں صفیں باندھے، حاضر رہنے والے۔ پھر رب کا حکم نافذ کرنے والے۔ پھر ذکر کرنے والے۔''

مولانا کے نزدیک یہ تینوں صفتیں فرشتوں کی ہیں، اور ان تینوں صفات کا ذکر بالفاظ دیگر سورہ کے آخر میں دوبارہ کیا گیا ہے۔

**وَالصَّافَّاتِ صَفّاً** کے ہم معنی ہے **وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّونَ۔ فَالزَّاجِرَاتِ زَجْرا** کی دوسری تعبیر ہے **وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ۔ اور فَالتَّالِيَاتِ ذِكْراً** کے ہم معنی ہے **وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُون۔**

**إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ أَمِيْنٍ۔** (الدخان:۵۱)

''خداترس لوگ امن کی جگہ میں ہوں گے''۔(سید مودودی)

''بیشک پرہیزگار لوگ امن کے مقام میں ہوں گے''۔(فتح محمد جالندھری)

مولانا امانت اللہ اصلاحی کا خیال ہے کہ یہاں مقام مصدر میمی ہے، نہ کہ اسم ظرف، اور اس صورت میں پوزیشن کے معنی میں ہے یا خوش حالی کے معنی میں۔

**وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ**۔(الرحمٰن:۴۶)

''اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اس کے لئے دو باغ ہیں''۔(فتح محمد جالندھری)

''اور ہر اُس شخص کے لیے جو اپنے رب کے حضور پیش ہونے کا خوف رکھتا ہو، دو باغ ہیں''۔(سید مودودی)

**وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى**۔(النازعات:۴۰)

''ہاں جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا ہوگا اور اپنے نفس کو خواہش سے روکا ہوگا''۔(محمد جوناگڈھی)

''اور وہ جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہش سے روکا''۔(احمد رضا خان)

**فَأَخْرَجْنَاهُم مِّن جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ۔ وَكُنُوزٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ**۔(الشعراء:۵۷،۵۸)

''تو ہم نے انہیں باہر نکالا باغوں اور چشموں، اور خزانوں اور عمدہ مکانوں سے''۔(احمد رضا خان)

''اِس طرح ہم انہیں ان کے باغوں اور چشموں، اور خزانوں اور ان کی بہترین قیام گاہوں سے نکال لائے''۔(سید مودودی)

''تو ہم نے ان کو باغوں اور چشموں سے نکال دیا، اور خزانوں اور نفیس مکانات سے''۔(فتح محمد جالندھری)

''بالآخر ہم نے انہیں باغات سے اور چشموں سے، اور خزانوں سے۔ اور اچھے اچھے مقامات سے نکال باہر کیا''۔(محمد جوناگڈھی)

مذکورہ ترجموں میں مقام کے لئے مکانات اور قیام گاہ کا ترجمہ درست نہیں ہے، حالت اور مرتبہ درست ترجمہ ہے۔

**كَمْ تَرَكُوا مِن جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ۔ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ**۔(الدخان:۲۵،۲۶)

''کتنے ہی باغ اور چشمے، اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے''۔(سید مودودی)

''کتنے چھوڑ گئے باغ اور چشمے، اور کھیت اور عمدہ مکانات''۔(احمد رضا خان)

''وہ کتنے ہی باغات اور چشمے چھوڑ گئے، اور زراعتیں اور عالی شان عمارتیں''۔(طاہر القادری)

''وہ بہت سے باغات اور چشمے چھوڑ گئے، اور کھیتیاں اور راحت بخش ٹھکانے''۔(محمد جوناگڈھی)

مذکورہ ترجموں میں **مقام** کے لیے محل، مکانات، ٹھکانے اور عمارتیں درست نہیں ہے۔ حالت اور مرتبہ درست ترجمہ ہے۔

**وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ عَسَى أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَاماً مَّحْمُوداً**۔ (الاسراء:۷۹)

''اور رات کے کچھ حصہ میں تہجد کرو یہ خاص تمہارے لیے زیادہ ہے قریب ہے کہ تمہیں تمہارا رب ایسی جگہ کھڑا کرے جہاں سب تمہاری حمد کریں''۔(احمد رضا خان)

''اور رات کو تہجد پڑھو، یہ تمہارے لیے نفل ہے، بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر فائز کر دے''۔(سید مودودی)

**وَإِذَا تُتْلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا لِلَّذِيْنَ آمَنُوا أَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَاماً وَأَحْسَنُ نَدِيّاً۔** (مریم:۷۳)

''اِن لوگوں کو جب ہماری کھُلی کھُلی آیات سنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں: بتاؤ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلسیں زیادہ شاندار ہیں؟''۔(سید مودودی)

''اور جب ان پر ہماری روشن آیتیں پڑھی جاتی ہیں کافر مسلمانوں سے کہتے ہیں کون سے گروہ کا مکان اچھا اور مجلس بہتر ہے''۔(احمد رضا خان)

''اور جب ان لوگوں کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو جو کافر ہیں وہ مومنوں سے کہتے ہیں کہ دونوں فریق میں سے مکان کس کے اچھے اور مجلسیں کس کی بہتر ہیں''۔(فتح محمد جالندھری)

''جب ان کے سامنے ہماری روشن آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو کافر مسلمانوں سے کہتے ہیں بتاؤ ہم تم دونوں جماعتوں میں سے کس کا مرتبہ زیادہ ہے؟ اور کس کی مجلس شاندار ہے؟''(محمد جوناگڈھی)

مذکورہ ترجموں میں **مَقَاما** کے لیے مکان کا ترجمہ درست نہیں ہے، البتہ حالت اور مرتبہ کا ترجمہ درست ہے۔

**قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيْكَ بِهِ قَبْلَ أَن تَقُومَ مِن مَّقَامِكَ وَإِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ أَمِيْنٌ۔** (النمل:۳۹)

''جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا: میں اسے حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانتدار ہوں''۔(سید مودودی)

''ایک بڑا خبیث جن بولا کہ میں وہ تخت حضور میں حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ حضور اجلاس برخاست کریں اور میں بیشک اس پر قوت والا امانتدار ہوں''۔(احمد رضا خان)

**وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُم مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِآيَاتِ اللّهِ فَعَلَى اللّهِ تَوَكَّلْتُ۔** (یونس:۷۱)

''اِن کو نوحؑ کا قصہ سناؤ، اُس وقت کا قصہ جب اُس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ ''اے برادران قوم، اگر میرا تمہارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سنا سنا کر تمہیں غفلت سے بیدار کرنا تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے''۔(سید مودودی)

''اور ان کو نوح کا قصہ پڑھ کر سنا دو۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اے قوم! اگر تم کو میرا تم میں رہنا اور خدا کی آیتوں سے نصیحت کرنا ناگوار ہو تو میں خدا پر بھروسہ رکھتا ہوں''۔(فتح محمد جالندھری)

''اور ان پر نوح (علیہ السلام) کا قصہ بیان فرمائیے، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم (اولادِ قابیل!) اگر تم پر میرا قیام اور میرا اللہ کی آیتوں کے ساتھ نصیحت کرنا گراں گزر رہا ہے تو (جان لو کہ) میں نے تو صرف اللہ ہی پر توکل کر لیا ہے''۔ (طاہر القادری)

مذکورہ ترجموں میں (میرا رہنا)، اور (میرا قیام) درست نہیں ہے، بلکہ درست ترجمہ ہے، میری سرگرمی۔

**وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ مِن بَعْدِهِمْ ذَلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ۔** (ابراہیم:۱۴)

''اور اُن کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے یہ انعام ہے اُس کا جو میرے حضور جواب دہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو''۔ (سید مودودی)

**إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرّاً وَمُقَاماً۔** (الفرقان:٦٦)

''اور دوزخ ٹھیرنے اور رہنے کی بہت بری جگہ ہے''۔ (فتح محمد جالندھری)

''بے شک وہ ٹھہرنے اور رہنے کے لحاظ سے بدترین جگہ ہے''۔ (محمد جوناگڈھی)

''وہ بڑا ہی برا مستقر اور مقام ہے'' (سید مودودی)

''بیشک وہ (عارضی ٹھہرنے والوں کے لئے) بُری قرار گاہ اور (دائمی رہنے والوں کے لئے) بُری قیام گاہ ہے''۔ (طاہر القادری)

مولانا امانت اللہ اصلاحی کا خیال ہے کہ مستقر مستقل قیام کو کہا گیا ہے، اور مقام عارضی قیام گاہ کو کہا گیا ہے، اس کی تائید اسی سورہ کی ایک دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے: **أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرّاً وَأَحْسَنُ مَقِيلاً** (الفرقان:۲۴) اس میں **مستقر** کے ساتھ **مقیل** کا لفظ آیا ہے جس کے معنی دوپہر کی استراحت کی جگہ کے ہیں۔ ''اس دن اہل جنت کا ٹھکانا بھی بہتر ہوگا اور مقام استراحت بھی'' (فتح محمد جالندھری) اس آیت میں مقیل کا عارضی قیام گاہ ہونا واضح ہے، پس مستقر تینوں مقامات پر مستقل قیام گاہ کے معنی میں ہے۔

**خَالِدِينَ فِيهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرّاً وَمُقَاماً۔** (الفرقان:٧٦)

''وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے کیا ہی اچھا ہے وہ مستقر اور وہ مقام''۔ (سید مودودی)

''ہمیشہ اس میں رہیں گے، کیا ہی اچھی ٹھہرنے اور بسنے کی جگہ''۔ (احمد رضا خان)

''اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور وہ ٹھیرنے اور رہنے کی بہت ہی عمدہ جگہ ہے'' (فتح محمد جالندھری)

**الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِن فَضْلِهِ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ۔** (فاطر:۳۵)

''جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ کے رہنے کے گھر میں اُتارا۔ یہاں نہ تو ہم کو رنج پہنچے گا اور نہ ہمیں تکان ہی ہوگی''۔ (فتح محمد جالندھری)

''وہ جس نے ہمیں آرام کی جگہ اتارا اپنے فضل سے، ہمیں اس میں نہ کوئی تکلیف پہنچے، نہ ہمیں اس میں کوئی تکان لاحق ہو''۔ (احمد رضا خان)

**آرا وافکار**

# خاطرات

کوئی بھی نیا ترجمہ یا تفسیری کاوش دیکھنے کا موقع ملے (اور ظاہر ہے کہ جستہ جستہ) تو میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ قرآن کے ان مقامات پر نظر ڈالی جائے تو تفسیری اعتبار سے مشکل ہیں۔ میری طالب علمانہ رائے کے مطابق یہ کوئی ڈیڑھ درجن کے قریب مقام ہیں۔ سو 'مشکل کشائی' کی جہاں سے بھی امید ہو، جستجو جاری رہتی ہے۔ میری نظر میں حالیہ سالوں میں تین ایسی کاوشیں کی گئی ہیں جن میں قرآن کے مشکل مقامات پر خاصا غور وخوض کیا گیا اور محض رسمی تفسیر پر اکتفا کرنے کے بجائے باقاعدہ تدبر کر کے کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے قرآن کے ہر طالب علم کا حق ہے کہ وہ ان کاوشوں سے استفادہ کرے۔ پیش کردہ حل پر اطمینان ہونا یا نہ ہونا ایک الگ معاملہ ہے، لیکن کسی بڑے دماغ نے علمی بنیاد پر کسی پہلو کو ترجیح دی ہو تو بہر حال اس پر غور کرنے سے بہت سی نئی راہیں کھلتی ہیں اور ایک سچے طالب علم کو درحقیقت یہی چیز مطلوب ہوتی ہے۔

۱۔ جناب جاوید احمد غامدی کا ترجمہ وتفسیر ''البیان''

۲۔ جناب مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب کا تفسیری سلسلہ بعنوان ''محفل قرآن''

۳۔ جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا ترجمہ ''توضیح القرآن''

مختصر حواشی کے ساتھ ترجمہ قرآن کے سلسلے کی اگر چند نمائندہ اور معیاری کاوشوں کا انتخاب کیا جائے تو حسب ذیل تراجم کا اضافہ کیا جا سکتا ہے:

۱۔ تسہیل بیان القرآن از قلم مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب

۲۔ تفسیر عثمانی از مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب

۳۔ تفسیری حواشی از مولانا ثناء اللہ امرتسری صاحب

میرے خیال میں قرآن مجید کی حل مشکلات کے لیے براہ راست غور وتدبر کے بعد ثانوی اور معاون ذرائع کے طور پر کم سے کم یہ پانچ تراجم ہر طالب علم کی میز پر لازماً ہونے چاہییں۔

قدیم تفسیری ذخیرے کے حوالے سے، عرب دنیا میں ایک اچھا کام یہ کیا گیا ہے کہ اہم مطولات کی تلخیصات تیار کر دی گئی ہیں۔ اس حوالے سے درج ذیل کاوشیں بہت مفید اور مددگار ثابت ہوں گی:

۱۔تفسیر طبری کی تلخیص
۲۔تفسیر ابن کثیر کی تلخیص
۳۔تفسیر بغوی کی تلخیص

اگر اسی نہج پر دیگر امہات کی تلخیصات بھی میسر ہو جائیں تو مراجعت واستفادہ میں کافی آسانی پیدا ہو جائے گی۔

جہاں تک کسی مقام کے باعث اشکال ہونے یا نہ ہونے کا تعلق ہے تو یہ ہر طالب علم یا صاحب علم کے لحاظ سے شاید ایک اضافی یعنی relative چیز ہے۔ایک کو جو مقام مشکل محسوس ہوتا ہے، ہوسکتا ہے دوسرے کو نہ ہوتا ہے۔

ذیل میں ان مقامات کی ایک فہرست درج کی جارہی ہے جو میرے لیے اپنی طالب علمانہ سطح کے لحاظ سے کافی غور طلب ہیں اور بعض مقامات پر کسی ایک تاویل کی طرف رجحان ہونے کے باوجود قرائن اتنے لطیف ہیں کہ بار بار غور کرنا پڑتا ہے۔واللہ اعلم

(۱)سورۃ البقرۃ،آیات ۷تا۱۶ (ومن الناس من یقول آمنا باللہ ..... )
محل اشکال: مذکورہ گروہ کی تعیین اور ذکر شدہ بعض اوصاف کا مفہوم۔

(۲)سورۃ البقرۃ،آیات ۱۴۹،۱۵۰ (ومن حیث خرجت .....)
محل اشکال: مذکورہ جملے کے تکرار کی معنویت۔

(۳)سورۃ البقرۃ،آیت ۱۸۴ (وعلی الذین یطیقونہ .....)
محل اشکال: کن لوگوں کو کس نوعیت کی رخصت دی گئی؟

(۴)سورۃ النساء،آیت ۳ (وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامی فانکحوا .....)
محل اشکال: شرط اور جزا کا باہمی تعلق۔کن خواتین سے نکاح کی ترغیب دی گئی ہے؟

(۵)سورۃ النساء،آیت ۱۱ (فان کان لہ اخوۃ فلامہ السدس)
محل اشکال: بھائی،حصہ دار نہ ہونے کے باوجود ماں کا حصہ کم کرنے کا باعث کیوں؟

(۶)سورۃ النساء،آیت ۱۱ (وان کان رجل یورث کلالۃ .....)
محل اشکال: رجل سے مراد وارث ہے یا مورث؟

(۷)سورۃ النساء،آیت ۱۵،۱۶ (واللاتی یاتین الفاحشۃ ..... والذان یاتیانہا .....)
محل اشکال: والذان یاتیانہا سے مراد؟

(۸)سورۃ النساء،آیت ۱۵۹ (وان من اہل الکتاب .....)
محل اشکال: اہل کتاب کس کی موت سے پہلے کس پر ایمان لائیں گے؟

(۹)سورۃ الانفال،آیت ۶۷ (ما کان لنبی ان یکون لہ اسری .....)
محل اشکال: اتنی سخت وعید کی وجہ اور پس منظر۔

(۱۰) سورۃ التوبہ، آیات ۱ تا ۵ (براء ة من الله ورسوله ........)

محل اشکال: اربعة اشهر اور فاذا انسلخ الاشهر الحرم کا باہمی تعلق؟ نیز آیات کے زمانہ نزول کی تعیین۔

(۱۱) سورۃ التوبہ، آیت ۶۰ (انما الصدقات للفقراء والمساکین ......)

محل اشکال: الصدقات سے جملہ اصناف صدقہ مراد ہیں یا بطور خاص زکوۃ؟ نیز حصر حقیقی ہے یا اضافی؟

(۱۲) سورۃ الرعد، آیت ۴۱ (ناتی الارض نقصها من اطرافها)

محل اشکال: ناتی الارض نقصها من اطرافها کا مفہوم۔

(۱۳) سورۃ الحجر، آیت ۸۷ (سبعا من المثانی)

محل اشکال: سبعا من المثانی کا مفہوم ومصداق۔

(۱۴) سورۃ الصافات، آیت ۷۸ (وترکنا علیه فی الآخرین)

محل اشکال: اس جملے کا مفہوم اور تاویل نحوی۔

(۱۵) سورۃ ص، آیت ۳۴ (والقینا علی کرسیه جسدا)

محل اشکال: اس جملے کا مفہوم۔

(۱۶) سورۃ الزخرف، آیت ۸۸ (وقیله یا رب ............)

محل اشکال: اس جملے کا عطف۔

(۱۷) سورۃ محمد، آیت ۳ (فاما منا بعد واما فداء)

محل اشکال: حصر کا مفہوم اور عملی نتیجہ۔

---

خیر النکاح ایسرہ۔ نکاح کا آسان اور سہل ہونا یقیناً مقاصد شریعت میں سے اہم ترین مقصد ہے۔ اس کا تعلق نہ صرف ''ضروریات'' (شاطبی کی اصطلاح میں) کی تکمیل سے ہے، بلکہ عفت وعصمت کی حفاظت بھی اس کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔

ہمارے معاشرے میں نکاح کے ساتھ جڑ جانے والی بری عادات ورسوم میں سے ایک، بے پناہ مالی اخراجات ہیں جنھوں نے اب تو ایک وبال جان کی صورت اختیار کر لی ہے۔ نوجوانوں کے لیے مناسب عمر میں شادی کرنا ایک خواب بن کر رہ گیا ہے۔

برصغیر کے سوشل اسٹرکچر میں اس کا سب سے بنیادی سبب یہ ہے کہ دو افراد کی شادی کا معاملہ دراصل دونوں طرف کے پورے کے پورے خاندانوں کا معاملہ تصور کیا جاتا ہے۔ کسی رشتے پر اگر خاندان کے سارے بڑے راضی نہیں تو ہنسی خوشی اور اتفاق سے شادی نہیں ہو سکتی اور ہو جائے تو بعد میں چل نہیں سکتی۔ خاندانوں کے مابین پھر مالی منافست کی

نفسیات ظاہر ہوتی ہے اور لمبی چوڑی تقریبات، پورے کے پورے خاندان کے لیے تحائف کا بندوبست اور اس طرح کی دیگر خرافات کا شامل ہوتے جانا ایک ناگزیر امر بن جاتا ہے۔

اس صورت حال کی اصلاح صرف اخلاقی وعظ سے نہیں ہوسکتی، نہ ہی کچھ اچھی مثالیں بڑے پیمانے پر اس میں کوئی تبدیلی لاسکتی ہیں۔ سماجی علوم کے مطالعے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک سوشل اسٹرکچر سے پیدا ہونے والی رسوم وعادات دراصل اس اسٹرکچر میں تبدیلی سے ہی بدل سکتی ہیں۔ اس وجہ سے میری طالب علمانہ رائے یہ ہے کہ ہمیں شادی کے معاملے کو اصلاً اور بنیادی طور پر دو افراد کا فیصلہ قرار دینے اور نئی نسل میں اس رجحان کی حوصلہ افزائی کرنے کی طرف بڑھنا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ خواتین کے لیے تعلیم اور معاش کے مواقع پیدا ہونے سے بھی وہ زندگی کے اس اہم فیصلے میں زیادہ بااختیار ہوں گی۔ خاندان اور برادری کی اہمیت بھی ہونی چاہیے، لیکن ضمنی اور ثانوی تاکہ وہ اس درجے میں stake holder نہ بن جائیں کہ افراد کی مصلحت اس کی ترجیحات کی بھینٹ چڑھا دی جائے۔

البتہ اس حوالے سے دو باتوں کا اہتمام ہونا چاہیے:

ایک، نئی نسل کی ذہنی تربیت کرنی ہوگی کہ اگر وہ مناسب عمر میں شادی کی نعمت سے بہرہ ور ہونا اور اس حوالے سے بااختیار ہونا چاہتی ہے تو اس کی ایک قیمت بھی ہوگی اور وہ یہ کہ وہ مادی سہولیات کے حوالے سے ''قناعت'' کا رویہ اختیار کریں اور توقعات کی سطح اتنی ہی رکھیں جتنی عملی حقائق اور وسائل اجازت دیتے ہیں۔ یہ ایک trade-off ہے۔ اگر آپ کو وہ ساری سہولیات چاہییں جو موجودہ اسٹرکچر میں ملتی ہیں تو اس کی قیمت بھی دینی پڑے گی، یعنی دس بارہ سال تک شادی میں تاخیر۔

دوسری بات یہ کہ حکومتوں کو اس طرح متوجہ کرنا چاہیے کہ وہ مناسب عمر میں شادی کرنے والے جوڑوں کے لیے subsidized rates پر رہائش گاہوں اور شادی الاؤنسز کا انتظام کرے تاکہ جو جوڑے اس رکاوٹ کی وجہ سے شادی نہیں کر پاتے، ان کی کچھ نہ کچھ معاونت کی جا سکے۔

---

''جدیدیت'' چند سیاسی، معاشی، سماجی اور فکری تبدیلیوں کا ایک جامع عنوان ہے جو مغربی تہذیب کے زیر اثر دنیا میں رونما ہوئیں۔ اس کے جواب میں مسلمان اہل فکر نے جو حکمت عملی اختیار کی، کئی پہلوؤں سے اس کی افادیت تسلیم کرتے ہوئے دو سوال بہرحال اٹھائے جا سکتے ہیں:

ایک، مزاحمت کے لیے اہداف اور ترجیحات کا غیر حقیقت پسندانہ تعین یا دوسرے لفظوں میں میدان جنگ میں محاذ کا غلط انتخاب۔ جب سرحد پر دشمن کی یلغار شروع ہوتی ہے تو دفاع میں سمجھ دار جرنیل کو یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ حملہ آور طاقت کا کہاں تک آگے بڑھ آنا ناگزیر ہے اور کہاں اس کے خلاف موثر مزاحمت کی جا سکتی ہے۔ اگر اس کے بجائے ایک ایک انچ کے دفاع کی حکمت عملی اپنائی جائے گی تو وہ محاذ بھی ہاتھ سے نکل جائیں گے جہاں مناسب تیاری سے مزاحمت کامیاب ہوسکتی تھی۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے دریا کے کنارے واقع بستی سیلاب کے خطرے سے دوچار ہو اور سارے اندازے بتا رہے ہوں کہ پانی کا بستی میں داخل ہونا اور ایک خاص سطح تک پہنچ کر رہنا طے ہے۔ اس کے باوجود بستی والے اپنے گھروں کے سامان اور مواشی وغیرہ کو کسی محفوظ جگہ منتقل کرنے کے بجائے پانی کو روکنے کے لیے دریا کے کنارے پر کچی اینٹیں چننا شروع کر دیں۔

دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ جب بھی کسی سماجی اسٹرکچر میں کوئی تبدیلی آتی ہے تو کئی مراحل سے گزر کر آتی ہے اور پہلے ہی دن حتمی طور پر یہ طے نہیں ہوتا کہ وہ مآل کار فلاں اور فلاں شکل اختیار کرے گی۔ اس تشکیلی مرحلے میں کئی عوامل مل کر اسے کوئی خاص رخ دیتے ہیں اور اس میں ان لوگوں کا کردار بہت اہم ہوتا ہے جو ہاتھ بڑھا کر جام و مینا اٹھا لینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ اس کے برخلاف اس مرحلے میں اس سے الگ تھلگ ہو کر یا کلی طور پر اس کے مزاحم بن کر کھڑے رہنے والے مثبت طور پر اس سارے عمل میں کوئی حصہ نہیں ڈال پاتے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نئے اسٹرکچر میں ان کا شمار پچھڑے ہوؤں اور پس ماندہ رہ جانے والوں میں ہو اور نئے ماحول سے شکایت اور گریز مستقل طور پر ان کی نفسیات کا حصہ بن جائے۔

ان دونوں غلطیوں کا باعث لمحہ موجود کی اسیری ہے، جو ایک طرف تو یہ صلاحیت سلب کر لیتی ہے کہ حالات کے رخ سے اس حقیقت کا پیشگی ادراک کیا جائے کہ کچھ تبدیلیوں کا عملاً رونما ہو کر رہنا سلسلہ اسباب وعلل کی رو سے طے ہے اور دوسری طرف نئی آنے والی تبدیلیوں کے ناپسندیدہ نتائج سے خوف زدہ کر کے ان مواقع اور امکانات سے بھی توجہ ہٹا دیتی ہے جن سے ممکنہ حد تک تبدیلی کا رخ کسی بہتر سمت میں موڑا جا سکتا تھا۔

مسلم معاشروں میں جدیدیت کی penetration کا عمل ابھی جاری ہے۔ بہت سی تبدیلیاں آ چکی ہیں اور بہت سی آنے والی ہیں۔ اگر ہمارے اہل فکر سابقہ حکمت عملی کے مذکورہ پہلوؤں سے کچھ سیکھ کر آئندہ کی حکمت عملی وضع کریں تو شاید ہم بحیثیت مجموعی کچھ بہتر نتائج حاصل کر سکیں۔

(یہ واضح رہے کہ میں جدیدیت کو بالجملہ منفی انداز سے نہیں دیکھتا۔ اس کے بہت سے پہلو مثبت اور قابل استفادہ بھی ہیں۔ یہ ساری گفتگو ''جدیدیت'' کے ان پہلوؤں کے حوالے سے ہے جن کا منفی اور ضرر رساں ہونا مسلم ہے۔)

## حالات وواقعات

محمد فیصل شہزاد

https://www.facebook.com/faisal.shahzad.1253236?fref=nf

# بچوں کے ساتھ جنسی بدسلوکی اور اس کا سدباب

[یہ ایک حساس، سلگتا ہوا مگر انتہائی ضروری موضوع ہے جو شاید کسی طبع نازک کو ناگوار گزرے مگر بچے سب کے سانجھے ہوتے ہیں اور یاد رکھیں کہ ہم سب کے ہی بچے ہر وقت جنسی کتوں کی نظر میں ہیں۔ اگر آج ہم ضروری اقدامات نہیں کریں گے تو خدانخواستہ ہمارے بچے بھی غیر محفوظ ہو سکتے ہیں۔ درخواست ہے کہ اسے پڑھیے، سمجھیے، عمل کیجیے اور شیئر کیجیے تا کہ ہمارا اور ملک کا مستقبل، ہمارے معصوم بچے، ان گلی کوچوں میں آزاد گھومتے جنسی درندوں کے ناپاک ارادوں سے محفوظ رہ سکیں۔ اللہ تعالیٰ سب بچوں کی ہر طرح حفاظت فرمائے آمین! اعداد و شمار اور معلومات کے لیے ادارہ ''روزن'' کی رپورٹس سے استفادہ کیا گیا ہے۔ (محمد فیصل شہزاد)]

سانحہ قصور ایک نہایت دل دہلا دینے والا، دردناک، شرم ناک بلکہ گھناؤنا ترین واقعہ ہے۔ 280 بچوں کا تو ذکر ہے، مجھے یقین ہے کہ اس سے دوگنے بچے ہوں گے جن کا بدترین جنسی استحصال کیا گیا ہوگا۔ اس گھناؤنے جرم کے ذمہ داران کے خلاف بڑی باتیں ہو رہی ہیں مگر کیا یہ سب پہلی بار ہوا ہے؟ کیا اس سے پہلے ہمارے معاشرے میں بچوں کے ساتھ جنسی بدسلوکی اور بدفعلی عام نہیں ہے؟ نہیں جناب! یہ گھناؤنا عمل ہر محلے کی سطح میں، ہر دوسرے اسکول اور ہر تیسرے اقامتی مدرسے میں ہو رہا ہے۔ ایک ادارے ''روزن'' کی تحقیق کے مطابق پاکستان میں ہر معاشرتی و اقتصادی پس منظر سے تعلق رکھنے والے 15 سے 20 فیصد لڑکوں اور لڑکیوں کو اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی جنسی طور پر ہراساں کیے جانے اور جنسی بدسلوکی سے واسطہ پڑتا ہے اور یہ بیس فیصد وہ ہوتے ہیں جو رپورٹ ہوتے ہیں، مگر سب جانتے ہیں کہ اس سے کئی گنا سلگتے واقعات وہ ہیں، جو کبھی منظر عام پر نہیں آتے!

میں ان سطور کے ذریعے سے کوشش کروں گا کہ دوستوں کو بتا پاؤں کہ معصوم پھول جیسے بچوں کے ساتھ بدفعلی صرف ایک ''عمل'' نہیں ہے، بلکہ بہت سارے بدافعال بچوں کے ساتھ جنسی استحصال کے ضمن میں آتے ہیں۔ اسی طرح اس ضمن میں ہمارے ہاں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے ان غلط فہمیوں کا ذکر کروں گا تا کہ ہم اپنے بچوں کو ہر بری نگاہ رکھنے والے کی گندی نگاہ سے زیادہ سے زیادہ حفاظت میں رکھ سکیں۔

## صرف بچیاں یا بچے بھی؟

1۔ ایک بہت بڑی غلط فہمی لوگوں میں اس خیال کا عام ہونا ہے کہ صرف بچیوں کے ساتھ ہی جنسی بدسلوکی ہوتی ہے! ایسا بالکل نہیں ہے۔ تحقیق کے مطابق بچیاں اور بچے تقریباً ایک جتنی تعداد میں جنسی بدسلوکی کا شکار ہوتے ہیں، یعنی ہر تین میں سے ایک بچی اور ہر چار میں سے ایک بچہ!! یہ اس لیے کہ بچے بچیوں کی بانسبت آسان ہدف ثابت ہوتے ہیں۔ ایک تو اس لیے کہ لڑکیوں اور بچیوں کی لوگ زیادہ حفاظت کرتے اور ان پر نظر رکھتے ہیں مگر بچوں کو جنسی بھیڑیوں کا تر نوالہ بننے کے لیے ایسے ہی چھوڑ دیا جاتا ہے! دوسری بات ہم جنس پرستی کی بڑھتی ہوئی لعنت ہے جس نے معاشرے کے ہر طبقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اسی لیے لڑکیوں کی نسبت چھوٹے لڑکوں کو آج اسکول، مدرسے، کھیل کا میدان حتیٰ کہ اپنے گھر میں بھی تحفظ حاصل نہیں ہے!

## اجنبی نہیں، رشتہ دار زیادہ خطرناک ہیں!

ایک اور بہت بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ بچوں کے ساتھ جنسی بدسلوکی کرنے والے زیادہ تر اجنبی مرد یا عورت ہوتے ہیں۔ یہ سنگین غلطی ہے۔ درحقیقت جنسی بدسلوکی کرنے والے مرد اور عورتیں دونوں ہی عام طور پر جنسی بدسلوکی کے لیے منتخب کیے جانے والے بچے سے پہلے ہی سے واقفیت یا کوئی تعلق رکھتے ہیں اور اکثر انہیں بچے تک براہ راست رسائی حاصل ہوتی ہے۔ خاندان کے افراد (فرسٹ کزنز، پھوپھا، خالو حتیٰ کہ چچا ماموں) خاندانی دوست، گھریلو معاون، پڑوسی اور ٹیچرز سب ہی جنسی بھیڑیے ثابت ہو سکتے ہیں! جی ہاں، استاد جسے روحانی باپ کہا جاتا ہے، وہ بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں ہیں۔ خود قصور کے جس علاقے میں بچوں سے جنسی زیادتی کا واقعہ پیش آیا ہے، وہاں کے ایک زمیندار مولانا عبید اللہ صاحب ہمارے ایک دوست کے دوست ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اس واقعہ میں بنیادی کردار مقامی اسکول کا ہے جہاں بے غیرت ٹیچرز ہی اس مکروہ کام کرنے والوں کو بچے سپلائی کرتے تھے۔ مگر اس واقعہ میں میڈیا نے اسکول کا ذکر سرے سے غائب کر دیا ہے۔ اب ذرا تصور کیجیے کہ اس طرح کے کسی واقعہ میں کسی مدرسے کا نام آیا ہوتا تو پھر میڈیا اور سول سوسائٹی کا کردار کیا ہوتا!

یہ ایک ضمنی بات آ گئی، بہرحال ایک غیر سرکاری ادارے روزن کی ایک رپورٹ کے مطابق دو سو بچوں کے ساتھ جنسی بدسلوکی کرنے والوں میں سے 49 فیصد رشتہ دار تھے، 43 فیصد واقف کاروں میں سے تھے (جن میں سب سے زیادہ شرح گھریلو ملازموں کی تھی)، اور صرف 7 فیصد کی تعداد اجنبی افراد کی تھی!

## غریب، امیر سب کے بچے!

اسی طرح ایک خیال یہ عام ہے کہ صرف غریب طبقے سے تعلق رکھنے والے بچے ہی بدفعلی کا شکار ہوتے ہیں۔ مگر یہ بات بھی غلط ہے۔ غرباء کے بچوں کے تقریباً برابر ہی متوسط اور امیر طبقے کے بچے بھی جنسی سلوکی کا شکار ہوتے ہیں!

## طریقہ واردات!

جیسا کہ عرض کیا گیا، جنسی بدسلوکی کرنے والوں کی اکثریت ایسے قریبی افراد کی ہوتی ہے جن پر اعتماد کیا جاتا ہے اور جن کے بارے میں کوئی ایسی حرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات ان کی حرکتیں کسی کے علم میں نہیں آتیں۔ پھر یہ کہ جنسی بدسلوکی کرنے والے یہ درندے اپنے شکار بچوں کی سادگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنے افعال کو راز میں رکھنے کے لیے جسمانی قوت استعمال کرنے کے بجائے، اپنے تعلقات کو بنیاد بناتے ہیں۔ جنسی بدسلوکی کرنے والے ایسا طرزِ عمل اپناتے ہیں کہ وہ بچوں سے قریب ہو جائیں اور وہ بچوں کو تحفہ دے کر، ان کی تعریف کر کے ان کا اعتماد حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سے وہ لوگ جو قریبی رشتہ دار نہ ہوں، وہ بچے کے گھر والوں کے ساتھ کسی ہمدرد کی صورت بنا کر قریبی تعلقات قائم کر لیتے ہیں تاکہ انہیں بچے کے ساتھ تنہائی میں ملنے کا موقع ملتا رہے اور ان کی طرف کسی کا دھیان بھی نہ جائے! ایک بار بچے کے ساتھ بے تکلف ہونے کے بعد وہ آہستہ آہستہ حدود کو پار کرنے لگتے ہیں۔ بعض اوقات اتفاقیہ طور پر چھو جانے کی صورت میں، جنسی نوعیت کے مذاق کرنے یا بچے کو مختلف مواقع پر لپٹانے یا چومنے کی صورت میں!

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معصوم بچہ جنسی بدسلوکی کرنے والے یا والی سے مانوس ہو جاتا ہے اور اس کی جانب سے چھوئے جانے یا باتیں کرنے پر بچے کی حساسیت کم ہو جاتی ہے۔ اگر پرائیویٹ مقامات پر ملاقات کے مواقع جاری رہیں تو جنسی بدسلوکی کرنے والے اپنے افعال میں قربت بڑھا دیتے ہیں۔ جنسی بدسلوکی کرنے والے ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں جن کے ذریعے یہ یقین ہو جائے کہ بچے اپنے ساتھ ہونے والے معاملات کسی کو نہ بتائیں گے۔ ان میں سے بعض براہ راست جارحیت (قوت کا استعمال) اختیار کرتے ہیں اور بچے کو بری طرح ڈرا دیتے ہیں کہ ''اگر اس نے کسی کو بتایا تو اسے یا اس کے گھر والوں کو نقصان پہنچا دیا جائے گا'' جب کہ بعض ایسے افراد بچوں کو ندامت یا شرمندگی کا احساس دلاتے ہیں کہ تم یہ کسی کو بتاؤ گے تو کتنی شرم کی بات ہے، سب تمہارا مذاق اڑائیں گے۔ اس طرح وہ بالآخر انہیں اس بات پر راضی کر لیتے ہیں کہ اس تعلق یا جنسی بدسلوکی کو راز میں رکھا جائے!

## بدسلوکی کرنے والے صرف مرد ہی نہیں عورتیں بھی!

بچوں کا جنسی استحصال کرنے والوں میں مردوں کے ساتھ عورتوں کے ذکر پر کچھ لوگوں کو تعجب ہوا ہوگا اور انہیں برا بھی لگے گا کہ ایسا کیسے ممکن ہے؟ عرض ہے کہ بالکل ممکن ہے۔ نوعمر قریب البلوغ بچے یا نوبالغ لڑکوں کا جنسی استحصال صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی کرتی ہیں۔ خاص طور پر امیر گھرانوں میں کام کرنے والی گھریلو ملازمائیں اس میں ملوث ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی دور کی آنٹیاں نوعمر بچوں جنسی استحصال کرتی ہیں، یہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ البتہ یہ ہے کہ فطرتاً ایسی گندی عورتوں کی تعداد ایسے مردوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے اور ان کے کیسز بھی بہت کم سامنے آتے ہیں مگر ایسا ہوتا ضرور ہے۔ یہ فرق بھی ضرور ہے کہ عورتوں کی طرف سے جنسی استحصال میں عموماً امیروں

کے بچے زیادہ شکار بنتے ہیں!

## جنسی بدسلوکی میں کیا کیا شامل ہے؟

جنسی بدسلوکی کی نمایاں صورتوں میں جنسی حملہ، اعضائے مخصوصہ کو سہلانا اور بچے کو ڈرا دھمکا کر زنا بالجبر یا لالچ دے کر زنا بالرضا کرنا تو شامل ہے ہی، مگر جنسی بدسلوکی میں کسی بھی قسم کے غیر مناسب جنسی مواد سے دوچار کرنا بھی شامل ہے، خواہ یہ مواد زبانی ہو یا مناظر کی صورت میں ہو۔ درج ذیل تمام عوامل جنسی بدسلوکی میں شامل ہیں:

☆ بچے کی جسم یا اعضاء کو اور خصوصاً پوشیدہ اعضاء کو غیر مناسب طریقے سے چھونا یا سہلانا۔

☆ بچے کو اس کے اپنے یا کسی دوسرے فرد کے جنسی اعضاء کو چھونے کے لیے کہنا۔

☆ بچے کے ساتھ جنسی ملاپ کرنا یا اسے کسی دوسرے سے یہ قبیح حرکت کرنے پر مجبور کرنا۔

☆ بچے کو عریاں تصاویر یا عریاں فلم دکھانا۔

☆ بچے کو عریانیت پر مبنی کہانی سنانا۔

☆ بچے کو عریاں تصاویر یا عریاں فلم بنوانے کے لیے کہنا۔

☆ بچے کو بے لباس کرنا یا اسے کسی اور کو بے لباسی کی حالت میں دیکھنے پر مجبور کرنا۔

☆ بچے کو اپنے پوشیدہ اعضاء دکھانا یا جنسی لطف حاصل کرنے کے ارادے سے بچے کے اعضاء کو دیکھنا۔

## کیا جنسی بدسلوکی کو روکا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا سادہ جواب یہ ہے کہ: ''ہاں''۔ بالکل ایسے اقدامات کیے جا سکتے ہیں جن کے ذریعے جنسی بدسلوکی ہونے کے امکانات کو کم کیا جا سکتا ہے۔ والدین اور دیکھ بھال کرنے والے ہر وقت اپنے بچوں کے ساتھ موجود نہیں رہ سکتے، لہٰذا بچوں میں اپنی حفاظت کے لیے مطلوبہ صلاحیتیں پیدا کی جانی چاہئیں۔ روایتی طور پر سب سے زیادہ عام طریقہ استعمال خوف کا استعمال ہے تاکہ بچے بات سننے اور ہدایات پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ مثال کے طور پر والدین اپنے بچوں کو ''اجنبی افراد سے خطرے'' کے بارے میں بتاتے ہیں، یعنی اگر وہ کسی اجنبی سے بات کریں گے یا اس کے ساتھ کہیں جائیں گے تو انہیں جسمانی طور پر نقصان پہنچ سکتا ہے، مگر جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جنسی طور پر بدسلوکی کرنے والوں میں سے زیادہ تر افراد اور متعلقہ بچے کے درمیان پہلے سے واقفیت ہوتی ہے، اس لیے یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ:

1۔ والدین کسی پر بھی اندھا اعتماد نہ کریں، قریب ترین رشتہ داروں اور دوستوں کے گھر بھی اپنے بچوں کو تنہا نہ چھوڑیں۔

2۔ اسی طرح انتہائی کوشش کیجیے کہ حتی الامکان بچے کو عصری ہاسٹلز یا اقامتی مدرسوں میں داخل نہ کریں، بلکہ ترتیب یہ بنائیں کہ بچہ تعلیم حاصل کر کے واپس گھر ہی آئے۔

3۔ خود اپنے بچوں کو کمپنی دیں، ان کے ساتھ کھیلیں اور ان کے اندر خود اعتمادی پیدا ہونے دیں۔ خود اعتمادی کے ساتھ اپنے آپ کو اس کے دوستوں کی طرح رکھیں کہ وہ ہر بات پر آپ کو بھی اعتماد میں لے۔

4۔ اس بات کو لے کر اس کے اندر غصہ اور غیرت پیدا کروائیں کہ کوئی بھی ان کی ''شرم'' والی جگہ کو بے اختیار ہاتھ لگنے کا ڈھونگ بھی کرے تو وہ بھرپور غصے کا اظہار کریں۔

5۔ اپنے بچوں کے اشارے کنائے یا ڈھکی چھپی باتوں کو ''بچوں کی باتیں'' کہہ کر کبھی نظر انداز نہ کریں۔ ان کی ہر بات کو سیریس لیں اور پھر خاموشی سے تحقیق کریں! اگر ایک بار آپ نے بچے کے اشارے کنائے کو نظر انداز کر دیا یا سختی سے اسے جھٹلا دیا تو آپ پر سے اس کا اعتماد ختم ہو جائے گا اور ہوس کے بجاری اس کے جسم و روح پر قبضہ کر لیں گے!

## بچوں کو ضروری آگہی دیجیے!

6۔ بچے کو بتائیں کہ والدین، والدین کے والدین اور بہن بھائیوں کے علاوہ کوئی بھی، کتنا ہی قریبی رشتہ دار ہو، ایک حد سے زیادہ بے تکلف ہوں یا تحفے تحائف دے تو محتاط ہو جائیں... تحفے کبھی خود نہ لیں، بلکہ اپنے والدین کو دینے کا کہیں!

7۔ ماں باپ بچوں میں کوئی بھی غیر معمولی حرکت دیکھیں تو فوراً چوکنا ہو جائیں...

☆ ان کے جسم پر چوٹ کے نشانات خصوصاً نازک اور پوشیدہ جگہوں پر کوئی نشان یا تکلیف کے آثار۔

☆ بچوں کا اچانک غیر معمولی طور پر حساس ہو جانا۔

☆ چپ چاپ رہنا۔

☆ ڈرے سہمے رہنا۔

☆ یا پھر اس کے بالکل برعکس بہت زیادہ بولڈ یا بدتمیز ہو جانا۔

☆ فحش حرکتیں کرنا یا فحش گفتگو کرنا جو پہلے نہ کرتا تھا۔

☆ بچوں کے پاس زیادہ پیسوں کا آ جانا (خود بھی میانہ روی سے کام لیں، نہ زیادہ جیب خرچ دیں اور نہ ہی بہت کم دیں)

☆ کھانے کی چیزیں یا کھلونے وغیرہ کا آ جانا۔

☆ دیر سے گھر آنا۔

☆ آپ کے کسی خاص واقف کار کو دیکھ کر عجیب سا برتاؤ کرنا وغیرہ۔

یہ سب علامات چوکنا کر دینے والی ہیں... انہیں دیکھ کر آپ کے دماغ میں الارم بج جانا چاہیے... مگر واضح رہے کہ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہم شکی ہو جائیں... ذرا ذرا سی بات پر بچوں سے سوال جواب کرنے لگ جائیں، اس سے اس کی شخصیت پر برا اثر پڑے گا... نہ ہی میں بلاوجہ کسی پر شک کرنے کی ترغیب دے رہا ہوں، مگر جب آپ کو کچھ بھی غیر

معمولی لگے تو اسے نظر انداز نہ کیجیے، براہ راست بچے سے نہ پوچھیے بلکہ اس کی جاسوسی کیجیے، ریکی کیجیے، باتوں ہی باتوں میں اس سے اس کی نئی چیزوں اور پیسوں کے متعلق اس طرح کریدیے کہ اسے ذرا شک نہ ہو! یہ سب ہمارے لیے اس لیے ضروری ہے کہ ہم اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں جس میں سب سے زیادہ بچوں پر ظلم ہو رہا ہے!

8۔ بچوں کو ضروری آگہی دیجیے... انہیں مہذب پیرایے میں بتایئے کہ ستر سے متعلق ہر بات عیب یا "گندی بات" نہیں ہے... بلکہ "گندی بات" غلط انداز میں ذکر یا "کسی" بھی دوسرے کا آپ کے جسم سے چھیڑ چھاڑ ہے... لیکن آج اس ضروری آگہی کو بھی گناہ سمجھا جاتا ہے اور عیب کی بات سمجھتی جاتی ہے... چاہے پھر بچہ دوسرے بگڑے ہوئے لوگوں سے غلط سلط معلومات حاصل کرے اور نتیجتاً ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ جائے!

آج میں اس پبلک فورم میں اس بات کا ڈنکے کی چوٹ پر اظہار کرتا ہوں کہ میں والد کے، بچوں کو بلوغت کے قریب آسان زبان اور لہجے میں، مہذب و شائستہ پیرایے میں ضروری جنسی مسائل کی تعلیم دینے کے حق میں ہوں... جس طرح ماں بچیوں کو بلوغت کے وقت سب کچھ سمجھاتی ہے کہ پھر اسے ادھر ادھر دیکھنا نہیں پڑتا... بالکل اسی طرح باپ (واضح رہے صرف باپ، استاد بھی نہیں) بچوں کو ایک حد میں رکھتے ہوئے ایسا اعتماد دے کہ وہ اپنا ہر مسئلہ، اپنی ہر بات آپ سے شیئر کرے... تاکہ آپ بھی وقت کے ساتھ ساتھ اس کی فطری تبدیلیوں کے بارے میں مہذب اور شائستہ پیرایے میں اسے سمجھا سکیں... یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ہمارے دینی مدارس میں اس کی مثال موجود ہے... بچوں کو بلوغت کے شروع میں ہی یہ سب پڑھایا جاتا ہے!

## اچھے برے لمس کی پہچان اور اللہ کی حفاظت!

9۔ بقول محترمہ شینا صاحبہ، پانچ سے نو سال تک کے بچوں سے جنسی بدسلوکی پر ٹھوس انداز میں بات کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ انہیں ''اچھے'' اور ''برے'' لمس (چھونا) کے بارے میں بتایا جائے۔ تمام بات چیت میں مثالیں دی جائیں تاکہ وہ بیان کردہ لمس (چھوئے جانے) اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احساسات کے درمیان تعلق قائم کر سکیں!

مثال کے طور پر اچھا لمس وہ ہوتا ہے جس سے ہمیں خوشی، پیار اور سکون کا احساس ہو مثلاً والدین کی جانب سے لپٹانا، یا استاد کی جانب سے حوصلہ افزائی کے طور پر پیٹھ پر تھپکی دینا!

برے لمس وہ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ہمیں یا تو جسمانی نقصان پہنچتا ہے یا کسی نہ کسی طرح بے چینی محسوس ہوتی ہے... اگر کوئی شخص ہمارے ستر پر ہاتھ مارتا ہے یا بے سکونی کی حد تک گدگداتا ہے تو یہ سب برے لمس ہوتے ہیں... خیال رکھیے کہ صرف جسمانی نقصان کی مثالیں نہ دی جائیں کیوں کہ اس طرح بچے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ برے لمس (چھونا) صرف وہ ہوتے ہیں کہ جن کی وجہ سے جسمانی درد ہوتا ہے، جب کہ یہ لازم نہیں ہے... بلکہ ان کی چھٹی حس کو بیدار کیجیے... اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت ہر انسان کو دی گئی ہے کہ اس کا دل اچھی بری نظر، اچھے برے لمس، اچھے برے

لہجے میں فوراً فرق کر لیتا ہے... آپ کو اپنے بچے کی اسی حس کو بیدار کرنا ہے کیوں کہ صرف جسمانی نقصان یا درد کی مثال کافی نہیں ہے... بہت سے عیار نفس کے غلام اس طرح اپنی نفسانی خواہش کو پورا کرتے ہیں کہ بچے کو کوئی جسمانی نقصان نہ ہو، لیکن ظاہری بات ہے کہ پیار سے سہلانا جس کی تہہ میں نفسانیت اور گندگی ہو، چاہے ظاہری تکلیف نہ دے، ایک بے چینی ضرور پیدا کر دے گی... بس یہی حس بچے میں بیدار کیجیے!

## اللہ کی حفاظت میں دیجیے!..... چند مسنون اعمال

آخری اور بنیادی بات یہ کہ یہ سب تو اسباب کے درجے میں ہے، جس کا ہمیں حکم ہے... مگر اصل حفاظت اللہ رب العزت ہی کرتے ہیں! اس لیے اخیر میں کچھ مسنون دعائیں اور کچھ بزرگوں کے تجربات اس ضمن میں پیش خدمت ہیں... ان اعمال کو خود بھی یاد کیجیے اور خصوصاً خواتین اور بچوں کو ضرور یاد کروا کر ان کو عمل پر مضبوط کیجیے... ان شاء اللہ غیب سے حفاظت ہوگی اور خواتین بچے ہر برے ارادے والے کی بری نگاہ سے مستور ہو جائیں گے ان شاء اللہ! صبح شام کی دعاؤں کے علاوہ، گھر سے باہر نکلنے کی دعا بچے کو اس دعا کا اہتمام کروائیے۔

☆**اَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيطَانٍ وَّهَامَّةٍ وَمِن كُلِّ عَينٍ لَّامَّةٍ** (ترمذی)

''میں پناہ پکڑتا ہوں اللہ تعالیٰ کے پورے کلموں کے ساتھ ہر شیطان کے اثر سے اور ڈسنے والے ہر زہریلے کیڑے سے اور لگنے والی ہر نظر بد سے۔''

یہ دعا نظر بد، شیاطین اور موذی مخلوق سے حفاظت میں عجیب تاثیر رکھتی ہے... نیت کے بقدر اس میں ہر طرح کی بد نظر" والے سے حفاظت ہوگی، ان شاء اللہ! صبح وشام اس کا ورد بہت مفید ہے۔

☆ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مشرکین کی آنکھوں سے مستور ہونا چاہتے تو قرآن مجید کی تین آیتیں پڑھ لیتے تھے۔ اس کے اثر سے کفار آپ کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ تین آیتیں یہ ہیں۔ ایک سورہ کہف میں، دوسری سورہ نحل میں اور تیسری سورہ جاثیہ میں۔'' (قرطبی)

**اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوهُ وَفِى اٰذَانِهِمْ وَقْرًا۔** (سورۃ الکہف)

**اُولٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ۔** (سورۂ نحل)

**اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوٰاهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلمٍ وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِه وَقَلْبِه وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِه غِشَاوَةً۔** (سورۃ الجاثیہ)

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معاملہ میں نے ملک شام کے ایک شخص سے بیان کیا، اس کو کسی ضرورت سے رومیوں کے ملک میں جانا تھا... وہاں گیا اور ایک زمانہ تک وہاں مقیم رہا... پھر رومی کفار نے اس کو ستایا تو وہ وہاں سے بھاگ نکلا... ان لوگوں نے اس کا تعاقب کیا... اس شخص کو وہ روایت یاد آ گئی اور مذکورہ تین آیتیں پڑھیں... قدرت نے ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈالا کہ جس راستے پر یہ چل رہے تھے، اسی راستے پر دشمن

گزر رہے تھے مگر وہ ان کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ (قرطبی)

امام ثعلبی رحمہ اللہ کہتے ہیں حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے جو روایت نقل کی گئی ہے میں نے رَے کے رہنے والے ایک شخص کو بتلائی... اتفاق سے دیلم کے کفار نے اس کو گرفتار کر لیا۔ کچھ عرصہ ان کی قید میں رہا... پھر ایک روز موقع پا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ لوگ اس کے تعاقب میں نکلے مگر اس شخص نے بھی یہ تین ا؟ یتیں پڑھ لیں... اس کا یہ اثر ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈال دیا کہ وہ اس کو نہ دیکھ سکتے تھے، حالاں کہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور ان کے کپڑے ان کے کپڑوں سے چھو جاتے تھے۔ (قرطبی)

امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان تینوں آیات کے ساتھ اگر وہ آیات سورہ یٰسین کی بھی ملا لی جائیں جن کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت پڑھا تھا تو نور علیٰ نور ہیں۔ اس رات جبکہ مشرکین مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کا محاصرہ کر رکھا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات پڑھیں اور ان کے درمیان سے نکلتے ہوئے چلے گئے بلکہ ان کے سروں پر مٹی ڈالتے ہوئے گئے۔ ان میں سے کسی کو خبر تک نہیں ہوئی، وہ سورہ یٰسین کی پہلی نو آیات ہیں۔

اس لیے ان تینوں آیات کے ساتھ سورہ یٰسین کی ابتدائی نو آیات خصوصاً خواتین اور بچے پڑھ لیا کیجیے، ان شاء اللہ ہر برے ارادے والے کی نگاہوں سے حفاظت رہے گی... زیادہ چھوٹے بچوں کی طرف سے خود ہی پڑھ کر ان پر دم کر دیجیے۔ بلاشبہ آج کا دور ہمارے بچوں کے لیے بہت خطرناک ہے... روز کوئی نہ کوئی دل دہلا دینے والی خبر سننے کو ملتی ہے، اس عمل کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہر برے ارادے والے کی نگاہ سے مستور رہیں گے ان شاء اللہ!


## سہ ماہی ''جی'' کا تازہ شمارہ

اہم عنوانات:

- استعمار، تاریخ اور ہماری فکر — محمد دین جوہر
- ہم عصر دنیا اور ہماری صورت حال — احمد جاوید
- اسلام اور ریاست: جوابی بیانیے پر ایک نظر — نادر عقیل انصاری
- مسئلہ امامت، امارت اور خلافت — مولانا محمد ایوب دہلویؒ
- اسباق — احمد جاوید

(مکتبہ امام اہل سنت پر دستیاب ہے)

## حالات وواقعات

محمد اظہار الحق

# دعوتِ دین اور ہمارے معاشرتی رویے

مولانا طارق جمیل کو احسن الخالقین نے حسن بیان کی قابل رشک نعمت سے نوازا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اس وقت مقبول ترین واعظ ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی جماعت کے دیگر اکابر کی طرح آہنی پردے کے پیچھے نہیں رہے بلکہ مخصوص دائرے سے باہر نکلے ہیں۔ ان کے ارشادات پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے عوام تک پہنچتے ہیں، سوشل میڈیا پر ان کے لاتعداد مداح ان کی تقاریر التزام اور اہتمام سے لاکھوں لوگوں کو سنوا رہے ہیں۔ تبلیغی جماعت کی قابل تحسین پالیسی پر عمل پیرا ہوتے مولانا طارق جمیل فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے بھی کوشاں رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں مختلف مسالک اور مذاہب کے درمیان مناظرانہ، مجادلانہ اور معاندانہ ماحول جس طرح ہر وقت گرم رہتا ہے اور آتشیں حدوں تک جا پہنچتا ہے اس کے پیش نظر مثبت لہجے میں کام کرنے والی جماعتیں اور علماء قابل قدر ہیں۔

مولانا نے حال ہی میں ایک ٹیلی ویژن پر تفصیلی انٹرویو دیا ہے جس کی خبر نما تلخیص پرنٹ میڈیا پر بھی عوام تک پہنچی ہے۔ حضرت مولانا کی عوام تک رسائی کی خوشگوار پالیسی سے حوصلہ پا کر ہم بھی کچھ طالب علمانہ اشکال پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ اشکال ہیں جو بے شمار ذہنوں میں موجود ہیں اور رہنمائی کے طلب گار ہیں۔ ہمارا مقصد حاشا وکلا اعتراض برائے اعتراض نہیں، ایسے رویے سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ ہمارا مقصد پوری دلسوزی اور عجز کے ساتھ محض رہنمائی کی طلب ہے اور عاجزانہ طلب ہے۔

مولانا نے بجا ارشاد فرمایا کہ عبادات اور معاملات کو الگ کرنے سے معاشرے میں شر پھیل رہا ہے۔ دین کو مسجد اور عبادت تک محدود کر دیا گیا ہے، حج، نماز، عمرہ، اور زکوٰۃ کو دین سمجھ لیا گیا ہے اور دنیاوی معاملات، اخلاق اور معاشرت کو دین سے خارج کر دیا گیا ہے۔ یہ تشخیص سو فی صد درست ہے۔ نبض دیکھتے ہوئے مولانا نے اپنا دست سلیم بالکل صحیح رگ پر رکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ نقصان دہ تفریق کس کے رویے کا نتیجہ ہے اور صورت حال کی اصلاح کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ دین کا طالب علم جب دیکھتا ہے کہ تعداد اور تنظیم کے اعتبار سے عالم اسلام کی سب سے بڑی اور مؤثر ترین حزب، تبلیغی جماعت اپنے لاکھوں نہیں کروڑوں وابستگان کو رات دن فضائل نماز، فضائل حج، فضائل قرآن، فضائل رمضان اور فضائل ذکر کا درس دیتی ہے اور اس ''تعلیم'' میں معاملات، حقوق العباد بشمول حقوق والدین اور حقوق اقربا، معاشرتی فرائض اور سماج کے دیگر پہلو جو دینی حوالے سے حد درجہ اہم ہیں، شامل نہیں تو حیران ہوتا ہے اور

پریشان بھی۔ یہ کہنا کہ جب فضائل قرآن پڑھا دیے تو اس میں سب کچھ شامل ہو گیا، اس لیے اپیل نہیں کرتا کہ قرآن پاک میں تو رمضان، نماز، ذکر، تبلیغ، تمام امور کے فضائل شامل ہیں، پھر ان کے لیے الگ الگ نصاب کیوں؟

مولانا نے جو فرمایا ہے کہ دین کو عبادات تک محدود کر دیا گیا ہے، ہمارے مسائل کی جڑ ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارے علماء، صلحاء، واعظین اور مبلغین کی روش بدستور وہی ہے جو تھی۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال دیکھیے کہ ایک ہفتہ پہلے ٹیلی ویژن کے ایک مشہور مذہبی پروگرام میں کسی نے دعاؤں کی قبولیت کے ضمن میں رہنمائی چاہی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ عدم احتیاط کے اس پرآشوب عہد میں ہماری دعاؤں کے قبول نہ ہونے کی بڑی وجہ اکل حلال سے محرومی ہے۔ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے جواب دینے والے صاحب کو، جو مولانا طارق جمیل کے شاگرد اور معروف شخصیت ہیں، اکل حلال کی اہمیت واضح کرنی چاہیے تھی، مگر انہوں نے محض اتنا بتایا کہ فلاں وظیفہ اتنی بار پڑھ لیا کریں۔ مقصود اس مثال سے یہ ہے کہ امر بالمعروف پر زور ہے اور نہی عن المنکر سے اجتناب۔ پھر ''معروف'' میں بھی وہ پہلو شامل کیے جاتے ہیں جو صرف حقوق اللہ سے متعلق ہیں۔

ایک اشکال یہ بھی ہے کہ ہمارے کاروباری حضرات کی کثیر تعداد مذہبی تنظیموں میں بالعموم اور تبلیغی جماعت میں بالخصوص شامل ہے۔ مولانا فرماتے ہیں، مدارس اور تبلیغ دین کا جو نظام پاکستان میں ہے پوری دنیا میں کہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بجا ارشاد فرمایا، افسوسناک Paradox یہ ہے کہ دینی مزاج رکھنے والے لاکھوں متشرع تاجروں اور دکانداروں کی موجودگی کے باوجود ملاوٹ، ناجائز منافع خوری، ذخیرہ اندوزی، وعدہ خلافی اور ٹیکس چوری اس طبقے میں از حد نمایاں ہے۔ خوراک تو خوراک ہے، ادویات اور معصوم بچوں کا دودھ بھی ملاوٹ سے پاک نہیں ہے۔

اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ ملک کا جو حصہ اغوا برائے تاوان اور کار چوری کا مرکز سمجھا جاتا ہے، تبلیغی جماعت کے وابستگان کی تعداد بھی وہیں زیادہ ہے۔ اور سالانہ اجتماع میں آنے والی بسوں کے زیادہ قافلے ادھر ہی سے آتے ہیں۔ اگر ایک خصوصی کتابچہ ان سماجی برائیوں بالخصوص ناجائز تجاوزات کے بارے میں نصاب میں رکھا جاتا تو معاشرے میں خاموش انقلاب آ سکتا تھا۔ ناجائز تجاوزات نے پورے ملک کو بدصورت اور تکلیف دہ بنا رکھا ہے۔ عبادات کے پابند تاجر اور دکاندار اس حقیقت سے یکسر غافل ہیں کہ وہ اس فٹ پاتھ یا اس جگہ کو استعمال کر کے جو ان کی ملکیت نہیں، وہ اپنی آمدنی کو مشکوک بنا رہے ہیں۔ مگر اکثریت الا ماشاء اللہ اس زعم میں ہے کہ وہ عبادات جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں، کافی ہیں۔

ایک سوال طالب علموں کے ذہن میں یہ بھی اٹھتا ہے کہ دین کا اصل امتحان دفتر، بازار، کارخانے، کھیت اور اہل و عیال کے درمیان ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ روایت ہے کہ ایک صحابی کو ماں کی خدمت کے لیے جہاد میں نہیں لے جایا گیا تھا۔ مگر زندگی کے اصل کارزار سے کاٹ کر چالیس دن یا چار ماہ کے لیے جو دینی ماحول میسر کیا جاتا ہے اس میں عملی زندگی کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔ اور پھر شعوری یا غیر شعوری طور پر عملی زندگی یا تو دفتر، بازار، کارخانے، کھیت اور اہل وعیال سے کٹ کر رہ جاتی ہے یا اس ضمن میں دینی تقاضے پورے نہیں کیے جاتے یا نہیں کیے جا سکتے۔ مولانا کا یہ فرمان قوم کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ والدین کے پاس بچوں کے لیے وقت نہیں جس کی وجہ سے ان کی تربیت نہیں ہو پاتی۔ تاہم دینی تربیت کے لیے جو بھرپور نظام الاوقات ہمیں دیا جاتا ہے اس میں بھی بچوں کے لیے

اور گھر بار کے لیے وقت نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اگر ہفتے میں ایک بار شب جمعہ کے لیے، مہینے میں تین دن سہ روزے کے لیے، سال میں چالیس دن تربیت کے لیے اور جب بھی کچھ تعطیلات ہوں ان میں دس دن کے لیے تشکیل پر جانا ہو تو بچوں پر توجہ دینا ناممکن نہیں تو از حد مشکل ضرور ہے۔ عملی نتیجہ یہ ہے کہ اس کار خیر میں جو لوگ رات دن مصروف ہیں اور ''جوڑ'' کے لیے الگ جاتے ہیں، ان کے اہل وعیال ان کی توجہ سے بالعموم محروم ہی رہتے ہیں۔

آخری گزارش، بہ احترام فراواں، یہ ہے کہ قوم کا سنجیدہ طبقہ اس سلوک سے جو الیکٹرانک میڈیا رمضان المبارک کے ساتھ کچھ عرصہ سے روا رکھے ہوئے ہے، از حد پراگندہ خاطر ہے۔ اشتہارات، نیلامی، انعامات اور اس قبیل کی دیگر سرگرمیوں کو رمضان کی مقدس شاموں اور راتوں کے ساتھ خلط ملط کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ''اسلامی شوبزنس'' باقاعدہ ایک الگ اکائی بنا دی گئی ہے۔ جو کچھ پردہ سیمیں پر اس سلسلے میں دکھایا اور کیا جاتا ہے، ناظرین کی اکثریت دیکھ تو لیتی ہے مگر دل کے نہاں خانے میں اسے ناپسند کرتی ہے۔ بہت سے لوگ سوشل میڈیا پر، کہ وہی ان کی رسائی میں ہے، اس سے کھلی بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا انتہائی منطقی اور خوبصورت بات کی ہے کہ ان پروگراموں کا تعلق کمائی سے ہے نہ کہ خدمت دین سے۔ ہم دست بستہ گزارش کرتے ہیں کہ کم از کم جنید جمشید صاحب کو اس ''گرم بازاری'' کا حصہ نہیں بننا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے مگر عوام کو معلوم ہے کہ جنید جمشید صاحب حضرت مولانا کے فیض رسیدگان میں سرفہرست ہیں۔ ایک اوسط ناظر اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ایسی سرگرمی، جو کمائی کے لیے ہے، دین کے لیے نہیں، تبلیغی جماعت اور حضرت مولانا کی نظر میں قابل قبول ہے اور یوں جائز ہے۔ یوں اس کا رخ فرد سے جماعت کی طرف مڑ جاتا ہے۔

ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک ہے نہ خوف لومۃ لائم کہ مولانا کی اوپن ڈور پالیسی دین کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اپنے خوبصورت بیان کے بعد اگر وہ سوالات کی اجازت مرحمت فرمایا کریں تو ایسے بے شمار اشکال دور ہو سکتے ہیں۔ دین کی تفہیم کے لیے وعظ ضروری ہے مگر مکالمہ اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ زبور عجم سے اقبال کے دو اشعار ان کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں:

ہمہ افکارِ من از تست چہ در دل چہ بلب　　گہر از بحر بر آری نہ بر آری از تست
من ہماں مشتِ غبارم کہ بجائی نہ رسد　　لالہ از تست و نمِ ابر بہاری از تست

مولانا کا پنجابی کا ذوق بہت عمدہ ہے، انہوں نے یہ ماہیا سن رکھا ہوگا:

مینہ وس گیا ٹیناں تے
اللہ تینوں حسن دتا
ورتا مسکیناں تے

ظاہر ہے یہاں حسن سے مراد حسن بیان ہے کہ بقول احمد ندیم قاسمی:

فقط اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
کہ ترا حسن، ترے حسن بیاں تک دیکھوں　　(بشکریہ روزنامہ ''دنیا'')

## حالات وواقعات

محمد سلیمان کھوکھر ایڈووکیٹ

# جانباز مرزا.....عظیم مرزا

ایک دفعہ کا ذکر ہے جب برصغیر میں انگریز کے عروج کا زمانہ تھا۔ دور دور تک کوئی ریاست اس کے ہم پلہ نہ تھی اور نہ کوئی طاقت۔ محاورہ تھا کہ انگریز سرکار میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ دوسری جنگ عظیم بھی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ انگریز سرکار کے کمزور ہونے کا کوئی امکان ہوتا۔ نہ ہی ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے الگ ملک کی کوئی قرارداد منظور ہوئی تھی۔ چہار سو اندھیرا تھا۔ برطانوی سامراج اپنے ہندوستانی فرزندوں کی مدد سے حکمران تھا۔ گنگا جمنا کی لہروں سے لے کر راوی جہلم کے کناروں تک اس کی ہیبت کے نشان کندہ تھے۔ ''انقلاب'' زندہ باد کی آواز پر نوجوانوں کو گولیوں سے بھون دیا جاتا یا چونے کی بھٹی میں ڈال کر زندہ جلا دیا جاتا۔ کاسہ لیسوں کو خطابات اور مخبروں کو انعامات دیے جاتے، اور سیاسی کارکنوں کو دادورسن کے قصائی خانوں میں تختۂ مشق بنا کر ان کے خون اور گوشت کا تماشہ دیکھا جاتا۔ اس اندھیرے میں بھی نوجوان حریت پسندوں کا قافلہ نیم جاں اپنے گریباں کے چاک سے آزادی کا پھریرا بنا کر لہراتا رہا۔ 1857ء سے پہلے اور بعد میں آزادی کی جتنی بھی تحریکیں چلیں ان میں مسلمان نوجوان کا نام اور کام ہمیشہ نمایاں رہا۔ جو لوگ زبان وقلم سے آزادی کی جنگ لڑے ان میں ایک بڑا نام مرزا غلام نبی جانباز کا تھا۔ جانباز کا پیدائشی تعلق امرتسر اور سیاسی تعلق سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی جماعت ''مجلس احرار'' سے تھا۔ زندگی بھر انگریز سرکار کے خلاف اس کی زبان وقلم شعلے اگلتی رہی۔ باقی زندگی میں جو الفاظ بچے وہ شاہ صاحب کی محبت میں صرف کر دیے۔ ''حیات امیر شریعت'' کے نام سے شاہ صاحب کی سوانح عمری کی کئی جلدیں مرتب کر ڈالیں۔ 1935ء میں گورداسپور جیل میں ''آتش کدہ'' کے نام سے اعلیٰ پائے کا شعری مجموعہ تخلیق کیا۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

بہاروں کے پسِ پردہ خزاں ہے ہم نہ کہتے تھے
چمن کی خاک میں آتش فشاں ہے ہم نہ کہتے تھے

اب آپ کو ''آتش کدہ'' کے نام سے کسی بھی لائبریری یا کتب خانے سے جانباز مرزا کا کوئی کلام نہیں ملے گا۔ ایک نسخہ مرزا صاحب نے جیل سے رہائی کے بعد مجھے دیا تھا۔ مگر یہ ہندوستان کی گورداسپور جیل اور انگریز سرکار نہیں بلکہ یہ پاکستان کی ''کوٹ لکھپت'' جیل سے رہائی کا موقع تھا اور ایوب خان کی سرکار تھی جب 1969ء میں ہم دونوں جمہوریت اور عوام کے حقوق کے لیے پابند سلاسل تھے۔ دار ورسن کے اس معرکہ میں اپنے دور کے ولی مولانا عبید اللہ

انور ہمارے قافلہ سالار تھے۔ اس قافلے میں شیخ رشید (بانی رکن پاکستان پیپلز پارٹی وفاقی وزیر) اور شیخ رفیق مرحوم (سابق گورنر و اسپیکر پنجاب اسمبلی) بھی ہمارے ساتھ تھے۔ شیخ رفیق مرحوم تب نیشنل عوامی پارٹی میں تھے۔ جاڑوں کے مہینے تھے، دن دھوپ سے لطف اندوز ہوتے ہوتے اور رات جیل کے غلیظ کمبلوں میں گزر جاتی۔ ایک روز میں نے جانباز مرزا صاحب سے پوچھا کہ آپ کتنی بار جیل گئے ہیں۔ پانچ چھ بار ہی جانا ہوا مگر کل ملا کر سزا 14 برس بنتی ہے، مرزا صاحب نے جواب دیا۔ مشقت بڑی سخت ہوا کرتی تھی۔ کولہو میں بیل کی جگہ جت کر کئی کئی گھنٹے اسے چلانا، سخت سردیوں میں ٹھنڈے پانی میں ردی کاغذوں کو ہاتھوں اور پیروں سے مسل مسل کر ان کا گودہ بنانا، اور راہداریوں کا پوچا کرنا تو عام سی مشقت تھی۔ جیل کے ہیڈ وارڈ کا عذاب مشقت سے بھی بڑا تھا۔ ساری ساری رات ہوا میں گالیاں بکتا رہتا اور آزادی کے متوالوں کے نام لے لے کر، کبھی عطاء اللہ شاہ بخاری اور کبھی بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی شان میں غلیظ الفاظ استعمال کرتا۔ جانباز مرزا کے مجموعہ کلام ''آتش کدہ'' کا انتساب بھی اسی جلاد ہیڈ وارڈ کے نام ہے۔ ملاحظہ ہو:

''اس سید زادے کے نام جو 1935ء میں گورداسپور ڈسٹرکٹ جیل کا ہیڈ وارڈ تھا اور جس کے تعدی آمیز تشدد کی یاد اب بھی ایام رفتہ میں تلخی بھر دیتی ہے۔''

جانباز مرزا نے دکھ بھرے لہجے میں کہا کہ اسے ان مصیبتوں اور کلفتوں کا کبھی غم نہیں رہا، صرف ایک بات نے ہمیشہ زندگی بھر کا دکھ دیا کہ جب بھی میں رہا ہو کر گھر آتا تو لوگ کہتے کہ ''یار مرزا کہاں رہے تم آج کئی سالوں کے بعد ملے ہو''۔ یہ الفاظ ہمیشہ تیر بن کر سینے پر لگتے۔ ان کا درد آج تک محسوس ہوتا ہے۔

پھر اللہ نے آزادی دی اور پاکستان بن گیا۔ جانباز مرزا بھی لاہور آ گیا۔ کچھ وقت گزارا، چند ماہ و سال بیتے تو معلوم ہوا کہ یہاں آزادئ فکر، آزادئ اظہار، آزادئ تقریر تو دور کی بات رزق تلاش کرنا بھی کار دارد ہے۔ قلم و زبان اور آزادی کا نقشہ اترا اور بے کسی نے اپنا رنگ دکھایا۔ پیٹ کی بھوک چمکی تو آشکار ہوا کہ رزق حلال تو اپنی جگہ رزق حرام بھی بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔ پاکستان فلم انڈسٹری نے آغا جی اے گل کی بدولت بہت سے سیاسی کارکنوں کو سہارا دے رکھا تھا۔ تب فلم انڈسٹری کا رخ کیا۔ ایکسٹرا کردار ادا کیے، کچھ فلموں کے مکالمے لکھ کر اور کچھ رسائل و جرائد میں مضامین لکھ کر زندگی کی گاڑی کھینچتے رہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان کا ایک بیٹا روزنامہ ''مشرق'' لاہور کے شعبہ طباعت میں معمولی ملازم تھا۔ شاد باغ میں ایک چھوٹا سا گھر تھا جہاں سبھی اہل خانہ مشترکہ خاندانی نظام کی بدولت گزر بسر کر رہے تھے۔ زندگی بھر کھدر کا لباس اس لیے استعمال کیا کہ بغیر دھوئے ایک ہفتہ تک چل جاتا تھا۔ آخری بار میں نے انہیں ہفت روزہ ''چٹان'' کے دفتر میں مسعود شورش کے پاس دیکھا۔ زندگی کی گاڑی کھینچتے کھینچتے، لاہور کی آدم خور مسافر ویگنوں پر سفر کرتے کرتے، رزق حلال کی تلاش کرتے کرتے، مکالمے لکھتے لکھتے ایک روز موت کے فرشتے سے پتہ نہیں کیا مکالمہ ہوا کہ اسی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

جانباز مرزا بلا کا جگر دار، غضب کا مقرر، صاحب اسلوب و صاحب دیوان شاعر تھا۔ اپنی جوانی کے 14 سال آزادی کے لیے دار و رسن اور طوق و سلاسل کی نذر کرنے والا جانباز مرزا جب اجل کے فرشتے کے ساتھ گیا تو لوگوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اخبارات نے خبر دینا بھی گوارہ نہ کیا۔ خبر چھپی بھی ہوگی تو اندر کہیں منڈیوں کے بھاؤ کے ساتھ۔ عزرائیل نے بھی کہا ہوگا کہ ''یار مرزا کہاں رہے، تم آج کئی سالوں بعد ملے ہو۔''

## مباحثہ ومکالمہ

مولانا عبدالمتین منیری*

# امام ابن جریر طبری کی مظلومیت

محترم اوریا مقبول جان، پاکستان میں سول سروس سے وابستہ ہیں۔گزشتہ کئی برسوں سے آپ کے کالم اردو کے بڑے اخبارات میں چھپ کر وسیع پیمانے پر پڑھے جارہے ہیں۔ چونکہ اسلام اور مسلمانوں سے وابستہ مسائل پر لکھتے ہیں جن میں ہمدردی کا پہلو بھی نمایاں رہتا ہے اور پھر وہ اپنے وسیع المطالعہ ہونے کا بھی احساس دلاتے ہیں، اس لیے بڑے پیمانے پر ان کے یہ کالم سوشل میڈیا پر بھی پوسٹ ہورہے ہیں۔گزشتہ دنوں سوشل میڈیا کے توسط سے آپ کے ۷/اور ۱۳ جولائی ۲۰۱۵ء کے دو کالم (روزنامہ 'ایکسپریس' لاہور) ہماری نظر سے گذرے جن میں آپ نے امت کے ایک جلیل القدر امام، مفسر اور مورخ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ پر خامہ فرسائی کی ہے اور ان کے بارے میں نہایت ہی بھونڈے انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے جس سے خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ موصوف بھی اب ان دانشوروں کی فہرست میں شامل نہ ہورہے ہوں جو ابتدا میں اسلام اور مسلمانوں سے ہمدردی اور دل سوزی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور جب مقبولیت کے بام عروج کو پہنچتے ہیں اور ان پر پڑھے لکھے افراد اعتماد اور بھروسہ کرنے لگتے ہیں تو پھر اسلام کے تہذیبی ورثے اور اسلامی تاریخ کے پورے دفتر ہی کو قابل گردن زدنی قرار دینے میں لگ جاتے ہیں۔اللہ کرے ایسا نہ ہو، لیکن کم از کم ان دو کالموں سے تو یہی لگتا ہے۔

ان کالموں کے پڑھنے سے محسوس نہیں ہوتا کہ ان کا لکھنے والا فرد اصل ماخذ سے باخبر فرد ہے۔ان کے لفظ لفظ سے زیر بحث موضوع پر ناواقفیت کا گمان گزرتا ہے۔اس تحریر کے ایک ایک حصے کو لے کر رد کرنا علم وتحقیق کے وقار کے منافی محسوس ہوتا ہے، لیکن یہ مسئلہ اتنا آسان بھی نہیں ہے کیونکہ کالم نگار نے ایک ایسے امام کی کردار کشی کا ہے جن کی تفسیر اور تاریخ کی کتابوں پر بعد میں آنے والے علماء اور محققین نے اعتماد اور بھروسہ کیا ہے اور ان تصنیفات پر اپنی علمی تحقیقات کی بنیاد رکھی ہے۔اگر اس بنیاد ہی کو ڈھا دیا جائے تو گزشتہ بارہ سو سال کے دوران منظر عام پر آنے والا پچاسوں نسلوں کا پورا علمی سرمایہ جس پر امت بجا طور پر فخر کرسکتی ہے، دھول کے مانند بیٹھ جائے گا۔لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کالم

* بھٹکل (انڈیا)۔ammuniri@gmail.com

نگار کے ایک ایک الزام کا جواب دینے کے بجائے چند موٹی موٹی اصولی باتوں پر روشنی ڈالی جائے۔

امام ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید طبری ف ۳۱۰ھ کا شمار خیر القرون کے ان ائمہ مجتہدین میں ہوتا ہے جنھوں نے آنے والی نسلوں کے لیے تفسیر حدیث فقہ اور تاریخ کا ایک ایسا علمی ذخیرہ چھوڑا، جن سے قیامت تک امت مسلمہ سیراب ہوتی رہے گی۔ آپ نے ایک ایسا دور پایا تھا جب کہ آئندہ نسلوں کے لیے حدیث وروایات کے ورثے کی من و عن، بلاکم وکاست منتقلی پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ آپ کے دور کے آتے آتے صحابہ تابعین اور تبع تابعین کا دور ختم ہو رہا تھا اور ڈر تھا کہ کہیں اس طبقے کے افراد کی آنکھیں بند ہوتے ہی علم وروایت کے انمول ذخیرے بھی قبروں کی مٹی میں گھل نہ جائیں، تو ان کی روایات اور آثار کی حفاظت پر توجہ زیادہ دی جانے لگی۔ چونکہ عہد رسالت وخلافت راشدہ تک راویوں کی کڑیاں مختصر اور سند عالی تھیں اور محدثین عظام نے حضرت عثمان رضی اللہ علیہ کے زمانے میں اٹھنے والے انتشار اور فتنے کے شروع ہوتے ہی علم سند ورجال کی تدوین کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور صحابہ کرام سے مستفید ہونے والے تابعین نے محسوس کیا تھا کہ انتشار کے اس دور میں اپنے اپنے گروہ کی تائید میں مفاد پسند عناصر نے جھوٹی روایات گھڑنا شروع کر دی ہیں۔ لہٰذا روایتوں کی اسناد نقل کرنے کا اہتمام والتزام کیا جائے اور ہر راوی کے حالات کے بارے میں معلومات جمع کی جائے۔ اس ضرورت علمی نے مسلمانوں کے ہاتھوں پر علم اسناد ورجال کا ایک ایسا علم ایجاد کروایا جس کی کوئی اور مثال کسی بھی دوسرے مذہب کے ماننے والوں میں نہیں ملتی۔ اس طرح لاکھوں افراد کا بائیو ڈاٹا (کوائف نامہ) تیار ہو گیا۔

آج کے زمانے میں سانس لینے والے قارئین کو شاید یہ جان کر حیرت ہو کہ وسائل کی کمی، کاغذ کی عدم دستیابی کے باوجود ابتدائی چار صدیوں میں جتنی تعداد میں روایت نقل کرنے والے افراد کے حالات اس طرح جمع ہوئے کہ فلاں سے کس روای نے روایت کی، اس کے شاگرد کون کون تھے، وفات کب پائی، اس کا مذہبی اور سیاسی رجحان کیا تھا، اس کا تعلق کس گروہ سے تھا، اس مقدار میں تاریخی مواد تو بعد کی ترقی یافتہ گیارہ صدیوں میں بھی جمع نہ ہو سکا۔ چونکہ سند کے ساتھ روایت نقل کرنے کی صورت میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنے والے ماہرین بکثرت پائے جاتے تھے، اس لیے ان روایات کی تحقیق کے تعلق سے ان میں زیادہ خوف نہیں رہا تھا۔ اس زاویہ نگاہ سے اطمنان نہ ہونے کی وجہ سے اگر قرون اولیٰ کے ہمارے علماء وائمہ کرام اپنے اسلاف سے علم اور روایت کو جمع کرنے کے لیے یکسو نہ ہو جاتے اور ہر ایک روایت کی جانچ پھٹک میں اپنی ساری توانیاں لگا دیتے تو ہماری تاریخ باریک باریک جزئیات اور مختلف پہلوؤں کے ساتھ ہم تک نہیں پہنچ پاتی، جن کے جانے بغیر واقعات کی حقیقتیں پوری رعنائی کے ساتھ ہم پر نہیں کھلتیں اور ہر حادثہ ہمارے سامنے آئینے کی طرح شفاف نظر نہیں آتا۔

علمائے حدیث کا اس پر اتفاق ہے کہ علامہ ابن الصلاحؒ کے مقدمہ کی حیثیت علم حدیث میں بنیاد کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ: مسند ابی داود طیالسیؒ، مسند عبید اللہ بن موسیٰؒ، مسند احمد بن حنبلؒ، مسند اسحٰق بن راہویہؒ، مسند عبد بن حمیدؒ، مسند الدارمیؒ، مسند ابی یعلی الموصلیؒ، مسند الحسن بن سفیانؒ، مسند البزار ابوبکرؒ اور اس جیسی جو کتابیں ہیں تو ان میں ان کا

طریقہ یہ ہے کہ ہر صحابی کی مسند میں ان کی روایت کردہ حدیث لائیں۔ اس پابندی کے بغیر کہ یہ حدیث حجت بنے گی یا نہیں (ص ۳۸)

اس کی تشریح کرتے ہوئے قریبی دور کے عظیم محدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ رقم طراز ہیں کہ: ''یہی قدیم محدثین اور مفسرین اور مورخین کا شیوہ رہا ہے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ایک باب سے متعلق تمام حدیثیں اور اخبار اس کی سند کے تذکرے کا سہارا لے کر لاتے ہیں، چاہے ان کی سند صحیح نہ ہو یا اس کی سند باطل ہونے کا انھیں علم ہو، کیونکہ سند کا ذکر ان روایات کے لانے پر مواخذہ سے انھیں بری کر دیتا ہے بشرطیکہ اس کے زمانے میں علم الاسناد مکمل طور پر سینوں میں زندہ ہو۔'' (الاجوبۃ الفاضلۃ، ص ۹۱)

مشہور محقق اور عالم دین شیخ محبّ الدین الخطیبؒ جنھوں نے مصر و عالم عرب میں شیعی اثرات کو ختم کرنے کے لیے بیسویں صدی کے اوائل میں زبردست کوششیں کی تھیں، آپ نے شیعیت کے رد میں اپنی مختصر سی کتاب **الخطوط العریضۃ** کے ذریعے بڑی شہرت پائی۔ وہ فرماتے ہیں کہ: امام طبری جیسے ان کے طبقے کے ثقہ اور ثبوت پیش کرتے والے علماء کی ضعیف روایات لانے کے سلسلے میں مثال آج کے دور میں عدالتی پروسیکوٹر کی ہوتی ہے۔ جب وہ کسی مقدمے کی تحقیق کر رہے ہوتے ہیں تو اس سے وابستہ دستیاب جملہ دلیلیں اور شواہد اکٹھا کرتے ہیں۔ حالانکہ انھیں ان میں سے بعض کے بودے اور ضعیف ہونے کا پورا علم بھی ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس اعتماد پر اسے نقل کرتے ہیں، کہ ہر چیز کو اس کی قدر قیمت کے مطابق تولا جائے گا۔ (ایضاً)

اس طرح طبریؒ جیسے ہمارے اسلاف میں سے بڑے بڑے روایتوں کے حاملین اس ڈر سے کہ ان تک پہنچنے والی کسی خبر کے بارے میں ضعف جاننے کے باوجود اس کی روایت میں اس وجہ سے تفریط نہیں کرتے تھے کہ اسے چھوڑ دینے سے علم کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رہ جائے۔ مگر وہ ہر روایت کو اس کی سند کے ساتھ لاتے ہیں تاکہ قاری معتبر راویوں کی پہچان کی بنیاد پر اس روایت کی مضبوطی کو جان لے۔ یا پھر غیر معتبر راویوں کی بنیاد پر اس کے ضعیف ہونے کا فیصلہ کرے۔ اس طرح وہ سمجھتے تھے کہ ان کے ہاتھوں تک جو کچھ پہنچا ہے، انھوں نے اپنے قاری تک دیانت داری سے پہنچا دیا ہے۔ (مجلۃ الازہر، ج ۲۴، ص ۲۱۴)

فن رجال میں حافظ شمس الدین احمد بن عثمان الذہبیؒ اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کا وہی مقام ہے جو فقہ حنفی کے فتاوی میں میں شامیؒ اور ابن الہمامؒ اور فقہ شافعی میں امام نوویؒ کا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے امام سلیمان بن احمد طبرانیؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ: قدیم حفاظ حدیث، موضوع احادیث کی روایت پر جب سکوت اختیار کرتے ہیں تو ان کا اعتماد حدیث کی سند کے ذکر پر ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کا اعتقاد ہوتا ہے کہ جب حدیث کو اس کی سند کے ساتھ لے آئے تو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو گئے اور اس کی تحقیق کی ذمہ داری اس کی سند پر غور کرنے کے لیے چھوڑ دی ہے۔ (لسان المیزان)

کسی بھی کتاب کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے دیباچے کو پہلے ایک نظر میں دیکھا جائے، تاکہ مصنف کا انداز تحریر اور طریقہ معلوم ہو سکے، ساتھ ہی ساتھ اس دور کے علمی ماحول اور پس منظر پر بھی نظر رکھی جائے۔

ایسا لگتا ہے کالم نگار نے اسے ضروری نہیں سمجھا اور مقدمہ کی جس عبارت کو امت کے جلیل علماء ومحققین نے طبریؒ کے دفاع اور ان کے حق میں استعمال کیا ہے، آپ نے خلط مبحث کر کے اس کا الٹا مطلب پیش کیا ہے۔ غالباً کالم نگار کے سامنے طبری کا انگریزی ایڈیشن رہا ہے، کیونکہ کتاب کے عربی ایڈیشن میں امام طبریؒ کی یہ صراحت موجود ہے کہ: **اذ لم نقصد بکتابنا هذا الاحتجاج بذلک** (**تاریخ الطبری**، اول، ص ۷) جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انھوں نے یہ کتاب اس لیے نہیں مرتب کی تا کہ لوگ اس سے سند لیں اور حجت پکڑیں، بلکہ ان تک جو پہنچا، آئندہ نسل کے لیے اسے من وعن پیش کر کے علم وروایت کے حفاظت کی اپنی ذمہ داری ختم کر دی۔ اب تحقیق کے مرحلوں سے گذار کر اسے مستند بنانا آپ کا کام ہے۔ تاریخ طبری کے اردو ترجمہ میں یہ عبارت ہمیں نظر نہیں آئی۔ اس کے چند سطور بعد امام طبری نے اپنے کتاب کے اسلوب تحریر کے بارے میں یہ عبارت لکھی ہے:

> ''لہٰذا ہماری اس کتاب میں کسی خبر وروایت کو پڑھنے والا اجنبی سمجھے، یا سننے والا قبیح قرار دے صرف اس بناء پر کہ وہ اس روایت کو درست نہیں سمجھتا تو اسے جان لینا چاہیے کہ ہم نے اپنی طرف سے کوئی ملمع سازی یا رنگ آمیزی نہیں کی، بلکہ بعض ناقلین سے وہ ہمیں اس طرح آ پہنچی ہیں، پس ہم نے ان کو اسی طرح آگے لکھ دیا، جس طرح وہ ہم تک پہنچی ہیں۔''

ہمیں اس بات کا بہت رنج ہے کہ اور یا مقبول جان صاحب جیسے قابلِ احترام قلم کار نے جس پر ایک دنیا اعتبار کرتی ہے، طبریؒ کے اسلوب کو سمجھے بغیر، جو عبارت ان کی براءت کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی اسے تمسخر اڑانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ امام صاحب کی شان میں افتراء پردازی کر کے ایک ایسی داستان کھڑی کی ہے، جس پر انھیں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی چاہیے اور غلطی کا اظہار علی الاعلان کرنا چاہیے۔ واضح رہے کہ اوپر امام طبریؒ کی جو عبارت کالم نگار نے اردو میں نقل کی ہے، اس میں امام طبری کی اس عبارت: **والآثار التی انا مسندها الی رواتها** جس کا مطلب ہے کہ جن روایات وآثار کو اس کے راوی کی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے چھوٹ گیا ہے جس کا سبب کالم نگار کی عربی سے لاعلمی ہے۔

اس سلسلے میں عثمان بن محمد الخمیس نے اس جانب توجہ دلائی ہے کہ: صرف سند کے ذکر پر اکتفا کرنے کا جہاں تک تعلق ہے، تو اس پر اکثر محدثین کا عمل رہا ہے، اگر آپ صحیحین کا استثناء کریں جنھوں نے صرف صحیح احادیث لانے کا عہد کیا ہے، ان کے علاوہ اگر آپ جامع الترمذی یا سنن ابی داود یا دارقطنی یا دارمی یا مسند امام احمد اور دوسری حدیث کی کتابوں کو دیکھیں گے تو پائیں گے کہ انھوں نے صرف صحیح روایات کو لانے کا اہتمام نہیں کیا ہے، بلکہ انھوں نے سند کا ذکر کیا ہے اور یہ آپ پر لازم ٹھہرایا ہے کہ ان کی اسانید پر نظر ڈالیں۔ اگر سند صحیح ہے تو اسے قبول کریں۔ اگر سند صحیح نہیں ہے تو اسے ٹھکرا دیں، امام طبریؒ نے بھی صرف صحیح روایات کو نقل کرنے کا عہد نہیں کیا ہے۔ انھوں نے تو جن سے روایت ان تک پہنچی ہے، اس کے ذکر کا وعدہ کیا ہے۔ (**حقبه من التاريخ مابين وفاة النبیؐ الی مقتل الحسين رضی اللّٰه عنه**)

ہمارے خیال میں یہ صرف اور یا مقبول جان کا عقدہ نہیں ہے، بلکہ یہ برصغیر شمالی ہند وپاک کے علماء ودانشوران کا

بھی مسئلہ ہے، امام طبریؒ کے تعلق سے ہمارے بعض بڑے بڑوں سے بھی چوک ہوئی ہے، اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جیسا کہ ہمارے بزرگ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ جب ہمارے جنوبی ساحلی قصبے بھٹکل تشریف لاتے تھے تو ہمیشہ کہا کرتے: ''یہاں کی سرزمین سے صحابہ وتابعین رضوان اللہ علیہم کے گزرنے کی خوشبو آتی ہے، آپ کے یہاں اسلام کا تروتازہ جھونکا ان حضرات کے قدموں کے ساتھ براہ راست آیا لیکن ہمارے شمال میں اسلام سرزمین عجم، ایران وطوران کی سرحدوں کو پار کرتا ہوا ملکوں ملکوں کی خاک چھانتا ہوا، ہاتھ بدل بدل کر، گھوم پھر کر درۂ خیبر کے راستے سے سیکنڈ ہینڈ پہنچا ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ علمِ سند ورجال کی طرف ہمارے علمائے ہند کا ابتدا ہی سے رجحان نہیں رہا، کیوں کہ شمالی ہند میں گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی ف ۱۰۵۲ھ کے ہاتھوں صحاح ستہ پہلی مرتبہ داخل ہوئی تھی۔ اس سے قبل یہاں پر ساتویں صدی ہجری کے محدث شیخ حسن بن محمد صاغانی لاہوری ف ۶۵۰ھ کی دو ہزار چھیالیس (۲۰۴۶) حدیثوں کا مجموعہ **مشارق الانوار النبویہ فی صحاح الاخبار المصطفویہ** رائج تھا۔ یہ ثانوی درجہ کا حدیث کا مجموعہ اسناد سے معری تھا۔ علم اسناد کے عروج کے دور میں یہاں مسند کتابوں کا رواج نہیں رہا۔ لہٰذا یہاں پر علم اسناد سے اعتناء کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی گئی۔ برصغیر میں شیخ عبدالحی لکھنوی فرنگی محلیؒ ف ۱۳۰۴ھ سے قبل کے علماء کی علم الجرح والتعدیل کے موضوع پر مستقل کتابوں کا فقدان پایا جاتا ہے۔ شیخ عبدالحی لکھنویؒ کی کتابوں کی پذیرائی بھی برصغیر کے بجائے عرب علماء میں زیادہ ہوئی۔ ہاں اس دوران شیخ محمد طاہر فتنی ف ۹۸۰ھ کا نام آتا ہے جن کی کتاب **المغنی فی اسماء الرجال** دوجلدوں میں حیدرآباد دکن سے چھپ کر آئی ہے۔ یہ بھی اپنے موضوع پر ثانوی درجے کی تصنیف شمار ہوتی ہے۔ مولانا فرنگی محلی کی کتابوں کی طرح اسے قبولیت عامہ حاصل نہیں ہوئی۔ ہماری کئی ایک محترم شخصیات کے امام طبریؒ کے تئیں غلط فہمی پر مبنی موقف اختیار کرنے کا سبب یہ ہے کہ چونکہ یہ علمی شخصیات مغربی سامراج کے دور عروج میں ابھریں، یہ لاکھ انکار کریں لیکن ان پر مستشرقین کے اسلوب نقد سے مرعوبیت جھلکتی ہے اور یہ فطری بات ہے کہ ان کے مخاطب یہی تو لوگ تھے۔ انھیں کے اسلوب میں انھیں اعتراضات کا توڑ پیش کرنا تھا۔

کالم نگار چونکہ عربی زبان سے ناواقف دکھائی دیتے ہیں، اس لیے لازماً ان کے سامنے نفیس اکیڈمی، کراچی سے چھپا ہوا یا پھر **تاریخ طبری** کا انگریزی ترجمہ شدہ نسخہ ہی ہے (جس میں مستشرقین نے اپنی بدباطنی کا زہر گھول رکھا ہے)۔ نفیس اکیڈمی کے تحت جو علمی ضخیم کتابوں کے ترجمے شائع ہوئے ہیں، ان کی تعریف ہونی چاہیے۔ لیکن تعریف کا یہ مطلب نہیں کہ انھیں معیاری بھی قرار دیا جائے۔ یا جن کتابوں کا ترجمہ کے لیے انھوں نے انتخاب کیا ہے اسے موزوں مانا جائے۔ اس سلسلے میں ان کی مطبوعات میں بڑا جھول پایا جاتا ہے۔ کئی ایک بڑی بڑی علمی کتابوں کا ترجمہ معیاری نہ ہونے کی وجہ سے بات کیا سے کیا ہوگئی ہے۔ دور حاضر کے ایک مایہ ناز مصنف مولانا محمد اسحاق بھٹی نے **بزم ارجمندان** میں اپنی ایک ایسے سینئر ساتھی کے بارے میں لکھا ہے کہ جو کہ بیک وقت صحافی، ناول نگار فلمی کہانی نگار بھی

تھے، اور نفیس اکیڈمی کے لیے انھوں نے درجنوں کتابوں کا ترجمہ بھی کیا کہ ان کے کسی عربی کتاب کے ترجمہ کا طریقہ یہ تھا، ایک نظر میں عربی کی کتاب کا صفحہ دیکھتے اور اسے بند کر دیتے اور یادداشت سے اس کا ترجمہ یا خلاصہ لکھ دیتے، اسی طرح انھوں نے بھٹی صاحب کو رقم دے ایک کتاب کا ترجمہ بھی کروایا تھا، جسے انھوں نے بھٹی صاحب کے بجائے اپنے نام سے چھاپ دیا۔

**تاریخ طبری** کے اردو ترجمہ کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا گیا ہے۔ طبری کی روح روایتوں کی اسانید میں پوشیدہ ہے۔ اس کے بغیر تفسیر ہو یا تاریخ کی کتاب، ان کی علمی حیثیت علماء کے نزدیک نہ ہونے کے برابر ہے۔ شاید ناشرین نے یہ سمجھ کر کہ ناموں کی تکرار سے اردو قاری بوریت محسوس کرنے لگے گا، اسانید کو حذف کر دیا ہے جس کے بعد ہر کوئی طبری کی نقل کردہ روایتوں کو آپ کی طرف منسوب کر کے، کالم نگار ہی کی طرح ان کا مذاق اڑا سکتا ہے۔ کالم نگار نے بہت برا کیا ہے جو امام طبریؒ کو ایک سڑک چھاپ بازار قصہ خوانی کے داستان گو کی حیثیت سے پیش کر دیا ہے۔ آیئے امام طبریؒ کے بارے میں چند ائمہ حدیث کے اقوال وآراء جاننے کی کوشش کرتے ہیں:

❖ محمد ابن جریر الطبری فقیہ عالم۔ (امام ابوالعباس محمد بن سریجؒ ف ۳۰۶)

❖ میں اپنے دور میں اس دھرتی پر محمد بن جریر سے بڑے عالم سے واقف نہیں ہوں۔ حنابلہ نے ان کے ساتھ بڑا ظلم کیا (امام الائمہ محمد ابن اسحاق بن خزیمہؒ)

❖ میں نے ابن جریر کے بعد علم اور علماء کی کتابوں، فقہاء کے اختلاف رائے اور علمی اور علوم کا ایسا ماہر نہیں دیکھا (احمد بن کامل القاضیؒ)

❖ طبری علماء کے اماموں میں سے ایک تھے۔ آپ کی رائے پر فیصلہ دیا جاتا تھا۔ اور آپ کی علمی معرفت اور فضیلت کی وجہ سے آپ کی رائے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ آپ نے اتنے علوم حاصل کئے تھے کہ جتنے آپ کے دور کے کسی ایک شخص میں جمع نہیں ہوئے۔ آپ کتاب اللہ کے حافظ تھے، علم قراءت قرآن کے معانی کی پہچان رکھتے تھے، احکام قرآن کے فقیہ تھے، سنن کے راستوں، ان کے صحیح یا سقیم ہونے کا اور ناسخ ومنسوخ کا علم رکھتے تھے، صحابہ وتابعین اور ان کے بعد آنے والوں کے بیان کردہ احکام فقہیہ اور مسائل حلال وحرام سے متعلق اقوال کے جاننے والے تھے، لوگوں کے دنوں اور ان کے اخبار کے عارف تھے۔ (خطیب بغدادیؒ)

❖ وہ ثقہ صادق اور حافظ تھے، تفسیر کے سردار، فقہ واجماع واختلاف کے امام، تاریخ اور دنوں کے، قراءت، لغت وغیرہ میں علامہ تھے (امام الذہبیؒ)

❖ وہ امام مجتہد، علم ودین کی دنیا کے ایک امام تھے (تاج الدین السبکیؒ)

❖ وہ عابدوں اور زاہدوں اور پرہیزگاروں میں سے تھے، انھیں حق بات سے کسی کی ملامت روک نہیں سکتی تھی، اور بڑے صالحین میں تھے (حافظ ابن کثیرؒ)

❖ امام محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ نے امام ذہبیؒ، ابن کثیرؒ، ابن عبدالبرؒ، خطابیؒ، امام شافعیؒ، ابن جریرؒ، ابن قتیبہؒ، اور ابو

عبیدؒ جیسے علماء کے تذکرہ کے بعد فرمایا کہ یہ وہ ہیں جن کی طرف اللہ اور اس کے کلام اور کلام سلف کے بارے میں رجوع کیا جاتا ہے۔

ام القری یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں عقیدہ کے شعبہ سے ۱۹۸۳ء میں ڈاکٹر احمد عوائشہ کو ان کے تحقیقی مقالہ **الامام الطبری و دفاعہ عن عقیدہ السلف** پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ جس میں امام صاحب کے عقیدے کا دفاع کیا گیا ہے۔ جس کے بعد مزید اس موضوع پر بحث کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ کالم نگار نے امام طبریؒ کے عقیدے اور حنابلہ کی آپ سے ناچاقی اور آپ کی وفات کے سلسلے میں مبالغہ آمیز اور من گھڑت کہانیاں تخلیق کی ہیں، اس بارے میں مکمل تحقیق اس ڈاکٹریٹ کے مقالہ میں موجود ہے۔ افادیت کے خاطر اس سلسلہ میں ائمہ حدیث وتاریخ کے چند اقوال کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

❖ شیعہ حضرات نے اس لیے آپ کے شیعہ ہونے کی تشہیر کی تاکہ حدیث وروایت کے ایک ستون پر سے اعتبار اٹھ جائے اور ایک اہم امام حدیث وفقہ کی صورت مسخ ہو جائے۔

امام الذہبیؒ کا قول ہے کہ: ابن جریر اور ابن ابی داؤد میں اختلافات ہوئے، یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ انصاف نہیں کرتے تھے، حنابلہ ابوبکر بن ابی داؤد کی حکمران پارٹی سے تھے، تو انھوں نے بات کا بتنگڑ بنا دیا اور ابن جریرؒ کے یہاں توڑ پھوڑ کی اور انھیں تکلیفیں پہنچائیں، تو ابن جریرؒ نے اپنا گھر پکڑ لیا، ابوبکر ابن ابی داؤد نے حاجب کی شکل میں حکومت وقت سے مدد لی اور ابن جریرؒ کو اپنی آراء سکھانے سے روک دیا۔ (**سیر اعلام النبلاء**)

ڈاکٹر احمد عوائشہ کی رائے ہے کہ امام ابن جریر پر حنابلہ کے تشدد کی جن تفصیلات کا ذکر کتابوں میں آیا ہے، ان میں حنابلہ کو شدت پسند ثابت کرنے کے لیے کافی رنگ بھرا گیا ہے۔ لہٰذا امام سبکیؒ نے امام ذہبیؒ کے قول کی تائید کرتے ہوئے کہا ہے کہ امام ابن جریرؒ کو حنابلہ نے گھر سے نکلنے سے روکا نہیں تھا، بلکہ امام صاحب نے خود سے گھر کا کونا پکڑ لیا تھا۔

آپ کی وفات کے وقت آپ کے جو شاگرد موجود تھے، ان میں سے ابوبکر بن کامل اور دوسرے لوگوں نے روایت کی ہے کہ آپ کی روح کے قبض ہونے سے کچھ پہلے آپ سے دریافت کیا گیا کہ ابوجعفر! آپ اللہ اور ہمارے درمیان حجت ہیں، آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں، کیا ہمارے دین کے تعلق سے کسی چیز کی وصیت کریں گے؟ اور کوئی ایسی بات بتائیں گے جو ہماری آخرت میں نجات کا ذریعہ بنے، تو آپ نے کچھ اس طرح بیان فرمایا کہ میں جس اللہ کی فرماں برداری کرتا ہوں۔ اور جو باتیں اپنی کتابوں میں بیان کی ہیں۔ ان پر عمل کرو۔ پھر تشہد اور اللہ کے ذکر کی کثرت شروع کر دی اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا، پھر اپنے ہاتھ سے آنکھیں بند کیں اور انھیں پھیلا دیا، پھر آپ کی روح پرواز کر گئی۔ (**تاریخ ابن عساکر**)

امام خطیب بغدادیؒ اور ابن عساکرؒ اور جمہور مورخین کی رائے ہے کہ آپ کو چاشت کے وقت دفن کیا گیا تھا، آپ کے جنازے میں لوگوں کی تعداد اتنی بڑی تھی جسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ حالانکہ اس کی کسی نے منادی نہیں کی تھی۔

ڈاکٹر احمد عواشہ کہتے ہیں کہ آپ کی وفات اور تدفین کے بارے میں جو اختلافی باتیں بیان ہوئی ہیں، ان کی کوئی

بڑی علمی اہمیت نہیں ہے۔ کیونکہ جب امام ابن جریرؒ کی وفات ہوئی تو لوگ سارے بغداد کے نواح واطراف سے امنڈ پڑے تھے۔ آپ کے گھر میں بھی نماز جنازہ ادا کی گئی، کئی مہینوں تک لوگ آپ کی قبر پر جاتے رہے اور نماز جنازہ پڑھتے رہے۔ اور ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہے۔ دین علم اور ادب سے وابستہ بہت ساری شخصیات نے آپ کے لیے مرثیے لکھے، ڈاکٹر صاحب نے اپنے تحقیقی مقالے میں کئی ایک ایسے مرثیوں کا تذکرہ کیا ہے۔

امام ابن جریر نے اپنی تفسیر اور تاریخ کی کتاب کے علاوہ بھی کئی ایک اہم کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب **تھذیب الآثار** بھی ہے۔ جس کے نامکمل ہونے کے باوجود اس میں عشرہ مبشرہ اور اہل بیت اور ان کے موالی سے مسند روایات، ان سے مروی فقہی مسائل، ان کے الفاظ کے معنی درج ہیں، اس کے بارے میں علماء کی رائے ہے کہ اگر یہ مکمل ہوتی تو اپنی مثال آپ ہوتی۔

شیخ عثمان الخمیس جنھوں نے امام محمد بن سعود یونیورسٹی۔ قصیم سے جید سعودی علماء سے تعلیم حاصل کی ہے اور دور حاضر میں ٹیلی ویژن پر شیعوں سے مناظرے میں کافی شہرت حاصل کی ہے اور جن کی کتاب کا تذکرہ پہلے آچکا ہے کہتے ہیں کہ **تاریخ طبری** اسلامی تاریخ کے موضوع پر سب سے اہم کتاب ہے۔ اس سے بہت کچھ لیا جاتا ہے، اہل سنت اور اہل بدعت دونوں اس سے نقل کرتے ہیں اور اس سے حجت لیتے ہیں تو پھر کیوں اسے تاریخ کی دوسری کتابوں پر ترجیح دی جائے؟ تو عرض ہے کہ امام طبریؒ کی تاریخ کو بہت سارے امور میں دوسری کتابوں پر سبقت حاصل ہے۔ جن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ امام طبریؒ کا زمانہ ان واقعات سے قریب ترین ہے۔

۲۔ امام طبریؒ سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔

۳۔ امام طبریؒ کی جلالت شان اور علمی مقام۔

۴۔ زیادہ تر تاریخ کی کتابیں آپ ہی سے نقل ہوئی ہیں۔

اگر بات یہ ہے تو اگر ہم براہ راست امام طبریؒ سے کوئی بات لینا چاہیں تو کیا کریں؟ کیونکہ جیسا کہ بیان ہو چکا اہل سنت اور اہل بدعت دونوں جو رائے ان کے مذہب کے مطابق ہوتی ہے نقل کرتے ہیں، تو کس طرح اس میں توافق پیدا کیا جائے۔ تو جیسا کہ میں نے بیان کیا، تاریخ طبری کا اہم امتیاز یہ ہے کہ وہ بغیر سند کوئی چیز نہیں لاتے۔ اہل سنت امام طبریؒ کی صحیح سند سے آئی ہوئی روایتیں لیتے ہیں اور اہل بدعت صحیح اور موٹی دبلی ہر ہر رطب و یابس چیز لیتے ہیں۔ **(حقبہ من التاریخ مابین وفاۃ النبیؐ الی مقتل الحسین رضی اللہ عنہ۔ ص۳۲)**

اس لیے جہاں آپ نے ابومخنف لوط بن یحیی، واقدی، سیف بن عمر التمیمی، کلبی وغیرہ روایتیں بیان کرنے والے افراد جن کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل ضعیف اور جھوٹے ہونے کا فیصلہ دیتے ہیں، ان کی روایتیں نہیں لیں گے۔

امام طبری کی کتابوں کی تحقیق اور اس کی اسانید کی صحت پر علمی دنیا میں کافی تحقیقی کام ہوا ہے۔ ان میں سے جو کتابیں ہمارے آرکائیوز میں محفوظ ہیں، ان میں سے چند کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے:

۱۔ **تحقیق مواقف الصحابہ فی الفتنۃ من روایات الامام الطبری و المحدثین**، تصنیف: ڈاکٹر امحزون، صفحات: ۶۹۴/ اس کتاب میں صحابہ کے مابین دور فتنہ سے متعلق امام طبری کی جملہ روایات کا دیگر محدثین کی نقل کردہ روایات سے موازنہ کر کے ایک ایک راوی اور واقعہ سے بحث کی گئی ہے۔

۲۔ **مرویات ابی مخنف فی تاریخ الطبری**، تصنیف: یحییٰ بن ابراہیم بن علی الیحییٰ، صفحات: ۲۵۸/ اس میں طبری کے اہم ضعیف راوی ابی مخنف کی ایک ایک روایت کی تحقیق کی گئی ہے۔

۳۔ **رجال تفسیرا لطبری جرحا و تعدیلا**، تصنیف: محمد صبحی بن حسن الحلاق، صفحات: ۶۰۸/ اس میں تفسیر طبری میں جن راویں سے روایتیں لی گئی ہیں، ان کے بارے میں فرداً فرداً تحقیق کی گئی ہے۔ اور اس سلسلے میں دو عظیم علما شیخ احمد شاکر اور محمود شاکر کی رائے بیان کی گئی ہے۔

۴۔ **صحیح تاریخ الطبری و ضعیف تاریخ الطبری**، تصنیف: محمد طاہر البرزنجی، اشراف: محمد صبحی حسن حلاق، ۱۳ جلدوں میں مطبوعہ اس کتاب میں طبری کی ایک ایک روایت کے بارے میں صحیح یا ضعیف ہونے کے تعلق سے تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔

اس طرح طبری کی سند کے ایک ایک راوی اور روایت کردہ واقعات کی تحقیق کی گئی ہے اور ان کا موازنہ مستند محدثین کی روایتوں سے کیا گیا ہے۔ خاص طور پر سعودیہ کی یونیورسٹیوں میں ان موضوعات پر ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیقی مقالات تیار ہوئے ہیں۔ جن کا عشر عشیر ابھی اردو میں نہیں آیا ہے۔

اردو میں امت اسلامیہ کے عظیم محسن اور ان کی علمی وراثت بنیادی امین امام طبریؒ کے تعلق سے باقاعدہ تحقیقی کتاب کی ضرورت ہے۔ یہ چند باتیں سرسری طور پر یاد آ گئیں، امید کے ان کے ذریعے تحقیق اور جستجو کے نئے دروازے کھلیں گے۔ اللہ کی توفیق ہمارے ساتھ ہو۔

❖❖❖

**مباحثہ ومکالمہ**

حافظ صلاح الدین یوسف

# کیا غامدی فکر و منہج ائمہ سلف کے فکر و منہج کے مطابق ہے؟

## غامدی صاحب کے دعوائے مطابقت کا جائزہ-۸

### ایک اور مغالطہ انگیزی اور علما پر طعنہ زنی

غامدی صاحب فرماتے ہیں:

''الائمة من قریش مشہور روایت ہے؛ (مسند احمد، رقم 11898) اس حدیث کے ظاہر الفاظ سے ہمارے علما اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ مسلمانوں کے حکمران صرف قریش میں سے ہوں گے، دراں حالے کہ یہ بات مان لی جائے تو اسلام اور برہمنیت میں کم سے کم سیاسی نظام کی حد تک کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا؛ اس مغالطے کی وجہ محض یہ ہوئی کہ ایک بات جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد کی سیاسی صورت حال کے لحاظ سے کہی گئی تھی؛ اسے دین کا مستقل حکم سمجھ لیا گیا۔'' (میزان، ص 64)

یہ محض علما پر طعنہ زنی ہے؛ علما نے اس سے وہی کچھ سمجھا ہے جس کی وضاحت خود انھوں نے کی ہے؛ علما نے اسے دین کا مستقل حکم نہیں سمجھا؛ اس کی جو وضاحت شیخ محمد ابوزہرہ نے علمائے اسلام کے موقف کی اور تمام احادیث و آثار کی روشنی میں کی ہے، وہ ملاحظہ فرمائیں:

نظر بریں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان اخبار و آثار سے قطعی و حتمی طور پر ثابت نہیں ہوتا کہ امامت قریش میں مقصور و محدود ہے اور اگر کوئی اور خلیفہ ہوگا تو اس کی خلافت، خلافت نبوت نہیں ہوگی؛ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آپ امت کو مامور فرما رہے ہیں کہ خلافت صرف قریش تک محدود ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کا فرمان طلب وجوب کے لیے ہے بلکہ آپ کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ قریش کی امامت افضل ہے نہ یہ کہ کسی اور کی امامت صحیح نہیں؛ اس کی وجہ بخاری و مسلم کی یہ روایات ہیں:

۱۔ ابوذر غفاریؓ روایت کرتے ہیں کہ مجھے میرے دوست (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) نے وصیت فرمائی کہ اگر تم پر ایک نکٹے حبشی کو بھی امام بنا دیا جائے تو اس کی اطاعت کرتے رہنا۔

۲۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم پر ایک حبشی کو امام بنا دیا جائے جس کا سر

منقی ایسا ہو تو اس کی بات سننا اور اس کے اطاعت شعار رہنا۔

ایک تیسری روایت اسی مفہوم کی صحیح مسلم سے نقل کر کے شیخ ابوزہرہ لکھتے ہیں:

''اگر مذکورۃ الصدر روایات کو حدیث 'ان ھذا الامر فی قریش' کے ساتھ یک جا کر کے دیکھا جائے تو یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ نصوص بہ حیثیت مجموعی یہ تاثر پیدا نہیں کرتیں کہ امامت قریش میں محدود ہے اور کسی اور کی خلافت صحیح نہیں؛ بہ خلاف ازیں احادیث کا بہ بحیثیت مجموعی یہ مفہوم ہوگا کہ غیر قریش کی امامت درست ہے اور آپ نے حدیث 'الامر فی قریش' میں اخبار بالغیب کے طور پر ایک ہونے والے واقعے سے آگاہ فرمایا تھا یا آپ کا مقصد یہ ہوگا کہ قریش کی خلافت دوسروں سے افضل ہے؛ یہ مطلب نہیں ہے کہ سرے سے کسی اور کی خلافت درست نہیں۔''

حضرت ابوبکر صدیق کے قول کا محمل اور مطلب بیان کر کے لکھتے ہیں:

''جب امامت کا انحصار وقوت وشوکت پر رکھا گیا ہے تو جہاں یہ اوصاف پائے جائیں گے، وہیں خلافت وامامت پائی جائے گی؛ یہ ہے امامت کے قریش میں ہونے کی اصل وجہ! اور یہ ہے ان آثار صحیحہ اور اس مناط ومدار کی حقیقت و ماہیت جس پر حضرت ابوبکر کے خلیفہ منتخب ہونے کے بارے میں اجماع منعقد ہوا تھا۔'' (المذاہب الاسلامیہ، اردو، ص112-113)

## گرگٹ کی طرح حالات وضرورت کے مطابق رنگ اور بھیس بدلنا

علمائے اسلام کا رویہ اور طرز استدلال آپ نے دیکھ لیا کہ وہ تمام احادیث کو دیکھتے اور ان سے بہ حیثیت مجموعی جو بات ثابت ہوتی ہے، اس کو اختیار کرتے ہیں؛ اس کو جمع وتطبیق کہا جاتا ہے؛ اس سے راویات کا ظاہری تعارض کا بھی دور ہو جاتا ہے اور مسئلے کے سارے پہلو بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ علمائے اسلام اس طرح کے ظاہری تعارض کو باہم متناقض ثابت کر کے احادیث کو رد نہیں کرتے بلکہ ان کا معقول حل اور محمل تلاش کر لیتے ہیں۔

اس کے برعکس منکرین حدیث اس قسم کے ظاہری تعارض کو دیکھ کر بڑے خوش ہوتے ہیں اور ان کو باہم متناقض قرار دے کر یا تو ساری متعلقہ احادیث کو رد کر دیتے ہیں جیسے رجم کی مستند اور متفق علیہ روایات کو رد کر دیا گیا یا پھر ان سے کوئی غلط مسئلہ نکال لیتے ہیں دراں حالے کہ ان سے وہ مسئلہ نہیں نکلتا؛ اس کی مثال خود غامدی صاحب کی 'میزان' سے ملاحظہ فرمائیں:

''چوتھی چیز یہ ہے کہ کسی حدیث کا مدعا متعین کرتے وقت اس باب کی تمام روایات پیش نظر رکھی جائیں؛ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی حدیث کا ایک مفہوم سمجھتا ہے لیکن اسی باب کی تمام روایتوں کا مطالعہ کیا جائے تو وہ مفہوم بالکل دوسری صورت نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال تصویر سے متعلق روایتیں ہیں؛ ان میں سے بعض کو دیکھیے تو بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی تصاویر ممنوع قرار دی گئی ہیں لیکن تمام روایتیں جمع کیجیے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ممانعت کا حکم صرف ان تصویروں کے بارے میں ہے جو پرستش کے لیے بنائی گئی ہوں۔ حدیث کے ذخیرہ سے اس طرح کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں لہٰذا یہ ضروری ہے کہ کسی حدیث کی مفہوم میں تردد ہو تو احادیث باب کو جمع کیے بغیر اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہ کی جائے۔'' (میزان، ص64-65)

اس اقتباس کو پڑھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ غامدی صاحب کی شخصیت گرگٹ کی طرح ہے جو رنگ بدلتی رہتی ہے اور موصوف حالات وضرورت کے تحت بھیس بدلتے رہتے ہیں؛ اس کی وجہ فکر ونظر میں پختگی کی کمی ہی نہیں بلکہ ابن الوقتی اور اسلام کے روئے آب دار کو مسخ کرنا ہے؛ یہ مقصد جس طرح بھی حاصل ہو، اس کے لیے اس طریقے کے اختیار کرنے میں انھیں کوئی تامل نہیں ہوتا اور جو بھی ہتھکنڈا انھیں اپنانا پڑے، اس کے لیے وہ تیار رہتے ہیں۔

انھیں اپنے یا ان کے 'امام' کے خود ساختہ نظریہ رجم کے اثبات میں رجم کی صحیح، متواتر اور متفق علیہ روایات حائل نظر آئیں تو ان کو باہم متناقض باور کرا کے یا قرآن کے خلاف قرار دے کر رد کر دیا۔

اب اس تازہ اقتباس میں انھوں نے اس کے بالکل برعکس رویہ اختیار کیا ہے؛ یہاں وہ تلقین فرما رہے ہیں کہ ایک مسئلے سے متعلقہ تمام احادیث کو دیکھنا چاہیے؛ اس سے ان کا ظاہری تعارض بھی دور ہو جاتا ہے اور مسئلے کے سارے پہلو بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ یہاں ان کی یہ بات درست ہے اور یہ وہی موقف ہے جو احادیث کی تشریعی حیثیت کے قائلین کا ہے؛ اگر یہی موقف احادیث رجم میں بھی اختیار کر لیا جاتا تو ان کا ظاہری تناقض بھی دور ہو جاتا اور رجم کے حد شرعی ہونے کا پہلو بھی نمایاں ہو کر سامنے آ جاتا لیکن وہاں چوں کہ ان کی ضرورت کچھ اور تھی، وہاں جمع وتطبیق کی یہ صورت جو علما ومحدثین بیان کرتے اور اختیار کرتے ہیں اور یہاں خود غامدی صاحب نے بھی اسے اختیار کر کے بیان کیا ہے، وہاں اسے اختیار نہیں کیا۔ لیکن یہاں اس کو اختیار کر لیا کیوں کہ یہاں ان کی ضرورت کچھ اور ہے اور وہ ہے تصویر سازی کا جواز واثبات۔

لیکن چوں کہ ان کی نیت اور مقصد میں فساد ہے، اس لیے طریقہ تو یقیناً محدثین والا اختیار کیا ہے تاہم نتیجہ محدثین کے نتائج سے یک سر سے مختلف اخذ کیا ہے؛ اس باب کی یہی تمام حدیثیں محدثین اور علماے اسلام کے سامنے بھی ہیں اور آج ہی نہیں، صدیوں سے ہیں لیکن ان کو کسی حدیث سے بھی تصویر کا جواز معلوم نہیں ہوا اور وہ آج بھی احادیث کی وجہ سے تصویر کی حرمت ہی کے قائل ہیں نہ کہ جواز کے۔

اس گروہ سے پوچھا جائے کہ کون سی حدیث کے کون سے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ ممانعت کا حکم صرف ان تصویروں کے بارے میں ہے جو پرستش کے لیے بنائی گئی ہوں کیوں کہ حدیث میں تو وجہ ممانعت، اللہ تعالیٰ کی صنعت خالقیت میں مشابہت ہے۔

علاوہ ازیں اگر ممانعت کی یہی علت (پرستش سے بچانا) تسلیم کر لی جائے، تب بھی اس کا جواز ثابت نہیں ہوتا؛ اس لیے کہ یہ علت آج بھی موجود ہے؛ آپ ان قبروں پر جا کر دیکھ لیں جو پرستش گاہیں بنی ہوئی ہیں اور مرجع خلائق ہیں؛ وہاں ننگ دھڑنگ ملنگوں اور صدیوں پہلے فوت شدہ بزرگوں کی جعلی تصویریں خوب فروخت ہوتی ہیں؛ لوگ ان کو لے جا کر فریم کروا کے گھروں اور دکانوں میں تبرک کے طور پر لٹکاتے ہیں؛ کیا یہ پرستش کی صورت نہیں ہے؟ گویا غامدی صاحب کا مذکورہ اقتباس ان کے تضاد کا بھی مظہر ہے اور بلا دلیل دعوے کا بھی۔

## جھوٹ اور بلا دلیل دعوے

اور بھی انھوں نے بلا دلیل دعوے کیے ہیں جن کی کچھ تفصیل گذشتہ صفحات میں بھی گزری؛ مثلاً:

رجم کی تعزیری سزا کا مبنیٰ، آیت محاربہ ہے اور یہ بات وحیِ خفی کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلائی گئی۔ اول تو موصوف وحی خفی سے کسی حکم کے اثبات کے قائل ہی نہیں ہیں اور پھر یہ سراسر جھوٹ اور دلیل دعویٰ ہے؛ اگر وہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو کوئی حدیث پیش کریں۔

ان کا یہ دعویٰ بھی بلا دلیل بھی ہے اور جھوٹ بھی کہ ائمہ سلف اور ان کے موقف میں سرمو فرق نہیں ہے۔

ان کا دعویٰ ''صرف کتاب وسنت تنقید سے بالا ہے'' سراسر جھوٹ، فریب اور بلا دلیل ہے؛ سنت نبوی کو تو وہ مانتے ہی نہیں ہے؛ ہاں، سنت جاہلیہ کو وہ مانتے ہیں؛ اگر یہ سنت جاہلیہ جو ان کے نزدیک کے قرآن سے بھی مقدم ہے، ان کے نزدیک تنقید سے بالا ہے تو یہ غامدی گروہ ہی کو مبارک ہو؛ اہل اسلام تو اس بات کو ماننے سے رہے۔

''امام فراہی کی تحقیق قرآنی نصوص پر مبنی ہے'' سراسر جھوٹ، فریب اور بلا دلیل دعویٰ ہے؛ یہ تو قرآن میں تحریف معنوی ہے؛ اسے قرآنی نصوص کس طرح باور کیا جا سکتا ہے؟

حضرت ماعز بن مالک اور غامدی قبیلے کی صحابیہ، ان کی بابت دعویٰ کہ ''وہ غنڈے، بدمعاش اور اوباش وآوارہ منش تھے؛ وہ عورت پیشہ وبدکار (فحبہ) تھی'' بلا دلیل اور جھوٹ ہے۔

ان کا یہ دعوی جھوٹ اور بلا دلیل ہے کہ ''قرآن نے اپنے متعلق یہ بات پوری صراحت کے ساتھ بیان فرمائی ہے کہ وہ قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے۔'' (میزان، ص31)

قرآن میں یہ صراحت کہاں ہے؟

کلام عرب یعنی زمانہ جاہلیت کے عرب شعرا کا کلام، جو فراہی گروہ کے نزدیک قرآن فہمی میں احادیث سے بھی زیادہ مستند اور مفید ہے، اس کی بابت دعویٰ ہے کہ

> ''لغت وادب کے ائمہ اس بات پر ہمیشہ متفق رہے ہیں کہ قرآن کے بعد یہی کلام ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور جو صحت نقل اور روایت باللفظ کی بنا پر زبان کی تحقیق میں سند وحجت کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (میزان، ص19)

کتنا بڑا دعویٰ ہے لیکن بلا دلیل اور پھر اس کی صحت نقل کا دعویٰ اس سے بھی عجیب تر ہے؛ نقد حدیث کے تو اصول وضوابط منضبط ہیں، اس کے باوجود وہ غیر محفوظ اور کلام عرب جس کی نہ کوئی سند ہے اور نہ پرکھنے کے اصول وضوابط، پھر بھی ان کی صحت نقل کا دعویٰ! ان هذا الاشیء عجاب.

اور ستم ظریفی کی انتہا، یہ کلام عرب اس کے باوجود کہ اس میں کچھ منحول کلام بھی شامل ہے (یعنی جعلی) (میزان، ص19) پھر بھی سب سے زیادہ با اعتماد ہے۔

پھر یہ دعویٰ دیکھیے:

''جس طرح نقد حدیث کے علما اس کی صحیح وسقیم روایتوں میں امتیاز کر سکتے ہیں ؛اسی طرح اس کلام کے نقاد بھی روایت وحدیث کے نہایت واضح معیارات کی بنا پر اس کے خالص اور منحول کو ایک دوسرے سے الگ کر سکتے ہیں۔''

(میزان، ص19)

نقد حدیث کے ذریعے سے صحیح سقیم روایتوں میں امتیاز کیا جا سکتا ہے؛ علماے اسلام تو اس بات کو مانتے ہیں لیکن آپ تو اس بات کو ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں؛ پھر اس کا حوالہ کیوں؟

پھر کلام عرب میں اصل اور جعلی کے پہچاننے کے نہایت واضح معیارات کیا ہیں؟ اور کہاں ہیں؟ کیا اس کی نشان دہی کی جا سکتی ہے؟

حدیث باسند کلام نبوی ہے؛ علاوہ ازیں اس کے پرکھنے کے اصول وضوابط بھی موجود ہیں؛ پھر بھی وہ غیر مستند اور کلام عرب، جس میں منحول (یعنی الحاقی اور جعلی) بھی ہے اور نقد وتحقیق کے کوئی اصول وضوابط بھی نہیں؛ وہ سب سے زیادہ مستند اور قابل اعتماد؟ تلك اذاً قسمة ضيزىٰ۔

## بے انصافی اور تحقیق کا ایک اور نمونہ

ان مغالطات، تضادات، بلا دلیل دعووں کے ساتھ اب ان کی بے انصافی کا ایک اور نمونہ اور تحقیق کا ایک اور انداز بھی دیکھ لیں۔

محدثین نے حدیث کی سند کی تحقیق کے لیے جو اصول وضوابط مقرر اور وضع کیے ہیں، ان کی تعریف کرتے ہوئے غامدی صاحب فرماتے ہیں:

''سند کی تحقیق کے لیے یہ معیار محدثین نے قائم کیا ہے اور ایسا قطعی ہے کہ اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جا سکتی۔''

(میزان، ص61)

لیکن اس کے باوجود احادیث غیر معتبر اور غیر محفوظ لیکن کلام عرب جس کی بابت وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ اس میں جعلی اور الحاقی (منحول) کلام بھی ہے یعنی عرب شعرا کے اصلی کلام میں جعلی کلام بھی شامل کر دیا گیا ہے اور اس کے اصلی اور جعلی کلام کو متمیز کرنے کا کوئی اصول وضابطہ بھی نہیں ہے، نیز وہ باسند بھی نہیں ہے؛ پھر بھی وہ سب سے زیادہ مستند اور قابل اعتماد ہے۔

اپنی اس بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے حضرت عمرؓ کا ایک بے سند قول نقل کیا ہے؛ حضرت عمر نے فرمایا:

عليكم بديوانكم لا تضلوا؛ قالوا ما ديواننا؟ قال: شعر الجاهلية، فان فيه تفسير كتابكم و معانى كلامكم۔

''تم لوگ اپنے دیوان کی حفاظت کرتے رہو، گم راہی سے بچے رہو گے؛ لوگوں نے پوچھا: ہمارا دیوان کیا ہے؟ فرمایا: اہل جاہلیت کے اشعار، اس لیے کہ ان میں تمھاری کتاب کی تفسیر بھی ہے اور کلام کے معانی بھی۔''

غامدی صاحب نے اس قول کا انتساب حضرت عمر کی طرف کیا ہے؛ جب ہم نے اصل کتاب تفسیر بیضاوی میں یہ

قول دیکھا تو اس میں 'رُوِیَ' کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے (انوار التنزیل، بیضاوی 1/459)، اور جو بات رُوِیَ' یا 'قِیلَ' سے بیان کی جاتی ہے، وہ بے سروپا سمجھی جاتی ہے کیوں کہ اس کا راوی ہی مجہول یعنی نامعلوم ہوتا ہے؛ خود غامدی صاحب کا موقف بھی ان الفاظ کے بارے میں یہی ہے جو ہم پہلے نقل کر آئے ہیں۔ (برہان، ص 284)

جب وہ خود 'رُوِیَ' یا 'قِیل' سے مروی بات کو مردود اور نا قابل اعتبار سمجھتے ہیں تو یہاں ایسے قول کو نقل کرنے کا مطلب کیا ہے؟ کیا اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ غامدی صاحب کا کوئی ایک موقف نہیں، کوئی اصول اور ضابطہ نہیں؛ ان کے نظریے اور زعم باطل کے خلاف بخاری و مسلم کی روایت بھی ہو تو وہ بھی ان کو (نعوذ باللہ) بے ہودہ روایت یا منافق کی گھڑی ہوئی نظر آتی ہے اور جس قول سے ان کی مطلب برآری ہوتی ہو تو وہ چاہے کیسا بھی گرا پڑا اور نا قابل اعتبار ہو، وہ ان کے نزدیک وحیِ الٰہی کی طرح معتبر ہے۔

ذرا غور کیجیے! یہ قول، قول عمر ہو سکتا ہے؟ جس میں قرآن کے بجاے اشعار جاہلیت کو گم راہی سے بچاؤ کا ذریعہ بتلایا گیا ہے اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بجاے ان اشعار جاہلیہ کو قرآن کریم کی تفسیر اور اس کے معانی کے دریچے کھولنے والے باور کرایا گیا ہے؟ کیا واقعی حضرت عمر کے نزدیک قرآن وحدیث کے مقابلے میں اشعار جاہلیت کی اتنی اہمیت ہو سکتی ہے؟ یقیناً نہیں ہو سکتی؛ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ یہ فراہی گروہ جیسے باطل نظریات کا ڈسا ہوا کوئی شیطان صفت شخص ہی ہے جس نے یہ بات گھڑ کر حضرت عمر کی طرف منسوب کر دی ہے۔

اس کے مقابلے میں حد رجم کے قرآنی حکم ہونے کے بارے میں ان کا خطبہ صحیح بخاری میں صحیح ترین سندوں کے ساتھ بیان ہوا ہے؛ اس کی بابت غامدی صاحب نے کہا ہے کہ یہ روایت کسی منافق نے وضع کی (گھڑی) ہے۔ (برہان، ص 61) اور اپنے استاذ امام کی رائے نقل کی ہے کہ یہ بے ہودہ روایت ہے۔ (برہان، ص 62) حضرت عمر کا یہ خطبہ ان شاء اللہ آگے ان کے استاذ امام کے نظریہ رجم کی بحث میں ہم بیان کریں گے؛ یہ خطبہ صحیح بخاری کی کتاب الحدود، حدیث نمبر 283 میں اور موطا امام مالک میں ہے۔

یہ دونوں کتابیں احادیث کے صحیح ترین مجموعے ہیں؛ موطا امام مالک کی صحت کے تو فراہی گروہ کے امام اول مولانا حمید الدین فراہی بھی احادیث میں اپنے ذہنی تحفظات یا تضادات کے باوجود قائل تھے؛ چنانچہ ان کا ایک مکالمہ جو حدیث کی حجیت وعدم حجیت کے موضوع پر مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے درمیان ہوا، قابل ملاحظہ ہے؛ مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں:

> ''مولانا حمید الدین مرحوم میرے بہت پرانے دوست تھے؛ قرآن شریف کے تناسق آیات میں ہمارا مذاق متحد تھا، اگرچہ طریقے اور پروگرام میں کسی قدر اختلاف رہا؛ وہ بائبل مجھ سے بہ درجہا اعلیٰ جانتے تھے اور میں حدیث ان سے زیادہ جانتا تھا۔ جب تک میں ہندوستان میں ان سے ملتا رہا، حدیث شریف کے ماننے کا جھگڑا کبھی ختم نہیں ہوا؛ اتفاقاً جس سال میں مکہ معظمہ پہنچا ہوں، اسی سال وہ بھی حج کے لیے آئے؛ ہماری باہمی مفصل ملاقاتیں رہیں؛ افکار میں بے حد توافق پیدا ہو گیا مگر وہاں بھی حدیث کے ماننے نہ ماننے پر بحث شروع ہو گئی۔ ہم نے سختی سے ان پر انکار کیا

اور کہا کہ حدیث کو ضروری ماننا پڑے گا؛ تنگ آ کر فرمانے لگے: آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا: موطا مالک! فرمایا: ہم اس کو مانتے ہیں؛ میں نے کہا: بس آج سے ہمارا نزاع ختم ہے، ہم آپ کو صحیح ماننے کے لیے مجبور نہیں کرتے۔'' (ماہ نامہ الفرقان (بریلی) شاہ ولی اللہ نمبر، ص 287، مطبوعہ 1359ھ)

غامدی صاحب کے گم راہ نظریات کے جو متضاد دلائل، بے بنیاد دعوے اور تعلیات تھیں، الحمد للہ، اللہ کے فضل اور اس کی توفیق سے ہم نے ان کی اصل حقیقت واضح کر دی ہے جو اس شعر کی مصداق ہیں: ع

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ وخم کا پیچ وخم نکلے

جو بھی فریب خوردہ شخص اس مضمون کو طلب حق کی نیت صادق سے اور غیر جانب دارانہ انداز سے پڑھے گا، ان شاء اللہ اس پر ان افکار باطلہ کے پیچ وخم کی تہ در تہ تہیں کھلتی چلی جائیں گی اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حجیت واہمیت شرعی پر جو دبیز پردے ڈالنے کی مذموم سعی اس گروہ کی طرف سے کی گئی ہے اور مسلسل کی جا رہی ہے، وہ بے نقاب ہو جائے گی؛ گم راہی کی وضاحت اور حق وصواب کی نشان دہی کی کوشش سے ہمارا مقصد اتمام حجت ائمہ سلف کے موقف کو نمایاں کرنے اور گم گشتگان راہ ہدایت کو روشنی مہیا کرنے کے سوا کوئی اور نہیں، واللہ علیٰ ما نقول شہید، تا کہ اس کے بعد!!

لیھلك من ھلك عن بینة ویحیی من حی عن بینة (الانفال 8:42)

''جو ہلاکت کو پسند کرے تو دلیل واضح کے بعد ایسا کرے اور جو زندہ رہے، وہ دلیل واضح پر زندہ رہے۔''

## مسئلہ شہادتِ نسواں میں اِدعا آت اور مسلمات کا انکار

اس مضمون کی تکمیل کے بعد ہمیں خیال آیا کہ آج سے 23 سال قبل 1989ء میں وفاقی شرعی عدالت میں مسئلہ شہادت نسواں پر بحث چلی تھی جس میں راقم نے بھی ایک مفصل مقالہ پیش کر کے حصہ لیا تھا۔ اس وقت عدالت کے چیف جسٹس گل محمد پرویزی ذہن کے حامل تھے؛ اس لیے انھوں نے غامدی صاحب کو بھی بلا کر ان کا موقف سنا تھا؛ راقم کو چیف جسٹس نے پابند کیا تھا کہ وہ ان کی بحث کو مکمل سنے، چناں چہ راقم نے اپنا بیان پیش کرنے کے بعد غامدی صاحب کے پیش کردہ دلائل بھی اپنے کانوں سے سنے۔ راقم کا خیال تھا کہ شاید چیف صاحب بعد میں راقم کو غامدی دلائل کا تجزیہ ومحاکمہ پیش کرنے کا موقع دیں گے لیکن جب یہ مرحلہ آیا اور راقم نے اس امر کی کوشش کی تو چیف صاحب نے فرمایا: آپ دونوں اخبار (اشراق، الاعتصام) کے اڈیٹر ہیں، وہاں اس مباحثے کو جاری رکھیں؛ عدالتی فورم اس کے لیے موزوں نہیں ہے۔

بہ ہر حال مسئلہ شہادت نسواں میں بھی اپنے عدالتی بیان میں غامدی صاحب نے مسلمات اسلامیہ کا انکار کرنے میں جس طرح کا ادعائی انداز اور تنہا روی کا مظاہرہ کیا، وہ دیدنی ہے؛ راقم نے ان کے دلائل کا یہ تجزیہ تحریری طور پر- اصل مقالہ کے علاوہ- عدالت میں پیش کر دیا تھا اور ماہ نامہ محدث، لاہور میں بھی شائع ہوا تھا؛ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے احباب وہاں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

## مباحثہ ومکالمہ

# مکاتیب

(۱)

برادر محترم جناب عمار خان ناصر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اگست کے ''الشریعہ'' میں ''تہذیبی کشمکش کا نیا باب'' کے عنوان سے جناب خورشید احمد ندیم کا کالم ''بشکریہ روزنامہ دنیا'' شائع کیا گیا۔ ندیم صاحب نے بہت اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ سنجیدگی اور متانت ان کے ہر کالم کی خصوصیات میں شامل ہیں۔ تاہم اپنے استاد محترم کی طرح ان کی تحریرات میں بھی بسا اوقات مبالغے اور انفعال کے مظاہر نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے ہم جنس پرستی کے مسئلے پر امریکی عدالت عظمیٰ کے فیصلے کو ''تاریخ ساز'' قرار دیا ہے، بعینہ اسی طرح جیسے ۲۰۰۱ء میں جناب جاوید احمد غامدی صاحب نے فتوی پر پابندی کے حوالے سے بنگلہ دیش کی عدالت عالیہ کے فیصلے کو ''صدی کا سب سے اہم فیصلہ'' قرار دیا تھا (حالانکہ اکیسویں صدی کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا)۔ مغرب کے ساتھ تعامل کے مسئلے پر جس طرح ہمارا روایتی دینی طبقہ ایک انتہا پر کھڑا ہے اسی طرح جناب غامدی صاحب کا حلقۂ اثر بھی ایک دوسری انتہا پر کھڑا ہے۔ اول الذکر گروہ کا ردعمل اگر اس طرح کے مسائل میں طنز واستخفاف کی صورت میں ہوتا ہے تو موخر الذکر گروہ کا ردعمل بالعموم بہت زیادہ متاثر ہونے کی صورت میں ہوتا ہے، خواہ اس متاثر ہونے کے بعد وہ اس کا جواب دینے کی کوشش ہی میں مصروف نظر آئے۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکی عدالت کا یہ فیصلہ انوکھا ہے نہ ہی تاریخ ساز، بلکہ یہ ''لادینی انسانیت'' (اگر secular humanism کے لیے یہ تعبیر قابل قبول ہو) کے بنیادی عقیدے کا محض ایک عملی تقاضا ہے۔ ندیم صاحب فرماتے ہیں:

> ''یہ الہامی روایت اور لبرل ازم کے درمیان جاری کشمکش کا فیصلہ کن موڑ ہے۔ انسان، سماج اور زندگی کے باب میں جوہری طور پر دو ہی نقطہ ہائے نظر رہے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان خدا کی مخلوق ہے۔ یہ حق خدا کا ہے کہ وہ اس کے مقصد حیات کا تعین کرے اور اس کے ساتھ اس کے لیے آداب زندگی بھی طے کرے۔ یہ خدا ہی ہے جس نے انسان کی فطرت کو تخلیق کیا۔ فطرت میں خیر وشر کا تصور رکھا اور پھر اس تصور کی یاد دہانی کے لیے اپنے پیغمبروں کو مبعوث کیا۔ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان کسی خالق کی مخلوق نہیں۔ زندگی اصلاً ایک ارتقائی عمل ہے۔۔۔ انسان اس تبدیل شدہ

حیات کا ایک ارتقائی مرحلہ ہے۔ اس کی زندگی کا نصب العین کیا ہے، اس نے جینے کے لیے کن آداب کا لحاظ رکھنا ہے، اس کا فیصلہ وہ اپنی عقل سے کرے گا۔ فطرت کسی مستقل ضابطے کی پابند نہیں ہے۔ یہ خارجی عوامل سے متاثر ہوتی ہے اور یوں اس کے مطالبات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔''

اس بارے میں عرض یہ ہے کہ انھوں نے مذہب کا جو موقف بیان کیا ہے وہ ایک بنیادی مغالطے پر مبنی ہے۔ اسی طرح جو ''دوسرا نقطۂ نظر'' انھوں نے ذکر کیا اس میں بھی انھوں oversimplification کی ہے۔ مذہب کے موقف کے متعلق بنیادی مغالطہ یہ ہے کہ خیر وشر کا اصل معیار انسانی فطرت ہے اور پیغمبر صرف اس کی ''یاددہانی'' کے لیے آتے ہیں؛ جبکہ درحقیقت ''الہامی مذہب'' کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اصل اور حقیقی معیار صرف وحی الٰہی ہے۔ چنانچہ فطرت کو اصل ماننے والے تو یہ کہیں گے کہ فلاں کام برا ہے، اسی لیے وحی نے اس سے روکا؛ جبکہ وحی کو اصل ماننے والے یہ کہتے ہیں کہ وحی نے فلاں کام سے روکا ہے، اس لیے وہ برا ہے۔ بہ الفاظ دیگر بات ان تین بنیادی مسائل تک آجاتی ہے کہ: حسن اور قبح افعال کی ذاتی خصوصیات ہیں یا نہیں؟ حسن اور قبح عقل کے ذریعے قطعی طور پر معلوم ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ اور عقل کا یہ فیصلہ حکم خداوندی کی حیثیت رکھتا ہے یا نہیں؟ الہامی مذہب ماننے والوں کا پہلے دو مسئلوں پر چاہے چھوٹا یا بڑا اختلاف ہو لیکن تیسرے مسئلے پر ان کا اتفاق ہے، سوائے ان عقل پرستوں کے جن کی رائے کو علمی دنیا نے کبھی الہامی مذہب کا ''اصل موقف'' تسلیم نہیں کیا، کہ عقل کا فیصلہ حکم خداوندی کی حیثیت نہیں رکھتا اور اسی لیے اصول فقہ میں حکم شرعی کی تعریف میں ''خطاب الشارع'' کو بنیادی رکن کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔

اسی طرح ہم جنس پرستی کے قائلین صرف وہ لوگ ہی نہیں ہیں جو انسانی فطرت کو کسی ضابطے کا پابند نہیں سمجھتے بلکہ اس کے قائلین اور پرجوش وکلا میں بہت سے وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ انسانی فطرت ہی اصل معیار ہے اور کوئی بھی قانون جو ''قانون فطرت'' (Natural Law) کے خلاف ہو، اسے قانون کے طور پر مانا ہی نہیں جا سکتا۔ اصول قانون (Jurisprudence) کے مبتدی طالب علم بھی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ Legal Positivists فطرت اور اخلاق کو ''اضافی'' (Relative) قرار دیتے ہیں جبکہ Naturalists ان کو متعین حقیقت (Absolute Reality) کے طور پر مانتے ہیں۔ اس لیے قانون اور اخلاق کی بحث میں Legal Positivists کا موقف یہ ہوتا ہے کہ اخلاقیات کے تصورات غیر متعلق ہیں اور یہ کہ قانون فطرت محض ایک ''افسانہ'' (fiction) ہے۔ اس کے برعکس Naturalists کا موقف یہ ہوتا ہے کہ قانون فطرت ہی اصل معیار ہے جسے عقل کے ذریعے دریافت کیا جا سکتا ہے اور اگر وضعی قانون (Positive Law) اس قانون فطرت کے خلاف ہو تو وہ کوئی قانون ہی نہیں ہے۔ واضح رہے کہ قانون فطرت کے ان قائلین کی اکثریت اس وقت ان لوگوں کی ہے جو اخلاقیات کے لیے وحی کے بجائے عقل انسانی کو ماخذ مانتے ہیں۔

بین الاقوامی قانون کے طالب علم جانتے ہیں کہ حقوق انسانی کے قانون (Human Rights Law) کی بنا دراصل قانون فطرت کے بنیادی مفروضات پر ہی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر میری رابنسن، جو اقوام متحدہ کے حقوق

انسانی کے کمیشن کی سربراہ تھیں، کے اس قول کے مضمرات پر غور کریں:

Human rights are inscribed in the hearts of people. They were there long before the lawmakers drafted their first proclamation.

پس جو لوگ ہم جنس پرستی کو ''انسانی حق'' مانتے ہیں وہ ''عقل وفطرت'' کے اسی تصور کو استعمال کرتے ہیں جو جناب غامدی صاحب کے مکتبِ فکر کے ''اصول ومبادی'' اور ''دین کے صحیح تصور'' کا رکن رکین ہے۔ کافی عرصے سے میں نے المورد کی ویب سائٹ www.understanding-islam.com پر سوالات اور مباحث کا مطالعہ نہیں کیا لیکن جن دنوں میں اس ویب سائٹ کی باقاعدہ ''سیاحی'' کیا کرتا تھا، ان دنوں (۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۱ء کے درمیان) اس پر ایک اہم مباحثہ یہ ہوا تھا کہ ہم جنس پرستی انسانی فطرت کے خلاف ہے یا نہیں اور جناب معز امجد صاحب کو اسے خلافِ فطرت ثابت کرنے میں کافی کدوکاوش کرنی پڑی تھی۔ وہ بحث بعد میں المورد کی جانب سے شائع کردہ کتاب *Answers on the Web* کی ۲۰۰۰ء کی اشاعت میں شامل بھی تھی اور میں حسن ظن رکھتا ہوں کہ بعد کی اشاعتوں میں بھی وہ خارج نہیں کی گئی ہوگی۔

چنانچہ اس وقت اسلام سمیت تمام الہامی مذاہب کو اصل خطرہ ان لوگوں سے نہیں ہے جو انسان کو زندگی کا ایک ارتقائی مرحلہ مانتے ہیں بلکہ ان لوگوں سے ہے جو لادینی انسانیت کے قائل ہیں اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس معرکے میں عقل وفطرت کو معیار ماننے والوں کی کاوشوں کا فائدہ لادینی انسانیت کے قائلین کو ہی مل رہا ہے۔

ندیم صاحب کا جو دوسرا کالم اسی شمارے میں شائع کیا گیا ہے، اس پر تفصیلی تبصرہ کسی اور وقت کروں گا لیکن ایک بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ انھوں نے علامہ شبلی نعمانی کے بارے میں اس تاثر کی نفی کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ مستشرقین کے زیر اثر تھے۔ یہ ندیم صاحب کی مجبوری ہے کیونکہ ان کے استاد گرامی کے نزدیک مغرب کے تہذیبی اور علمی حملوں کا جواب صرف ''دبستانِ شبلی'' ہی سے ممکن ہو سکا تھا۔ جناب غامدی صاحب کے پیروکاروں میں جن چند اصحاب سے یہ توقع تھی کہ وہ مجتہد فی المذہب کا درجہ تو حاصل کر ہی لیں گے ان میں ایک ندیم صاحب بھی تھے لیکن وہ بھی نرے مقلد ہی نکلے وگرنہ ان کے لیے تو کم از کم یہ بات عیاں ہونی چاہیے تھی کہ مستشرقین کے جواب میں ہی سہی، اور نہایت خلوصِ نیت سے ہی سہی، لیکن علامہ شبلی (اللہ انھیں غریقِ رحمت کرے) نے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر کے کئی ایسی باتوں کا انکار کیا، یا ان کی تاویل کی، جو تاریخی طور پر مسلمات میں شمار کی جاتی رہی ہیں۔ وہی رویہ تین نسلیں گزرنے کے بعد بھی دبستانِ شبلی کے منتسبین کے ہاں بدستور پورے آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔

محمد مشتاق احمد

اسسٹنٹ پروفیسر قانون، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

mushtaqahmad@iiu.edu.pk

۶ ذوالقعدہ ۱۴۳۶ھ (۲۲ اگست ۲۰۱۵ء)

(۲)

محترم محمد عمار خان صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

الشریعہ کا ہمیشہ سے ہی انتظار رہتا ہے اور یقین جانیے اس کے مندرجات سارے کے سارے ہی علم میں اضافے کا باعث ہوتے ہیں۔ الشریعہ کی یہ پالیسی میرے نزدیک احسن ہے کہ اس میں مختلف مکاتب فکر، حتی کہ اپنے خلاف بھی بڑے کھلے دل سے، کی تحریروں کو جگہ ملتی ہے۔ مباحثہ ومکالمہ اور تنقید سے ہی علم کی ترقی ممکن ہے۔ اسی سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ بڑے خلوص سے لکھے گئے مقالات کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے، ورنہ زندگی غلط فہمی میں ہی گزر جائے۔ اسی احساس کے پیش نظر میں نے اپنی کتاب، : بینک انٹرسٹ: منافع یا ربا" آپ کی خدمت میں پیش کی تھی کہ اس پر کھل کر تنقید ہوگی اور مجھ پر اپنی غلطی واضح ہوگی۔ وہ تو شاید کسی مصلحت یا کسی مناسب اہل علم کی عدم دستیابی کی وجہ سے نہ ہو سکا۔ یہ میں نے اپنا نقطہ واضح کرنے کی خاطر لکھا کہ تنقید کو میں علم کی ترقی کے لیے ضروری خیال کرتا ہوں۔

غامدی صاحب کی فکر پر جب محترم حافظ صاحب کی تحریر کا آغاز ہوا تھا تو ایک لحاظ سے خوشی ہوئی تھی کہ کوئی علمی چیز سامنے آئے گی۔ ایک دو قسطوں کے بعد میں نے مضمون پر سرسری سی نظر ڈالنے کے بعد آگے بڑھ گیا، اور اب حالت یہ ہے کہ میں اس پر نظر ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ میری بدقسمتی ہی ہے کہ انداز تحریر کی وجہ سے شاید کوئی بڑی علمی چیز سے محروم ہوا جاتا ہوں۔ کاش کہ موصوف اس بحث کو علمی انداز میں آگے بڑھاتے۔ اب گزارش یہ ہے یہ سلسلہ کہیں رکے گا بھی یا ہم جیسے لوگوں کے ذوق پر برچھی بن کر دل و دماغ کو زخمی کرتا رہے گا۔ یہ درست ہے کہ وکل فوق ذی علم علیم، لیکن اہل علم کو دوسروں کو امتحان میں نہ ڈالیں تو بہتر ہوگا۔

اسی طرح ایک اور علمی سلسلہ جو سال ہونے کو آیا ہے اور ابھی تک جاری ہے یعنی اردو تراجم قرآن پر ایک نظر، اللہ جانے یہ کب ہماری جان چھوڑے گا۔ اس کے لیے میں صرف دعا ہی کر سکتا ہوں۔

الفاظ کے انتخاب میں اگر کسی کی دل آزاری کو کوئی پہلو نکلتا ہو تو معافی کا خواہاں ہوں۔ بندہ بشر ہونے کے علاوہ عجمی ہوں۔ والسلام

محمد انور عباسی

anwarabbasi@hotmail.com

## اخبار وآثار

مولانا حافظ محمد رشید *

# سید احمد شہیدؒ کی خدمات پر ایک بین الاقوامی کانفرنس کا احوال

۲۹ جولائی تا ۳۱ جولائی ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ میں قائم ''ہزارہ چیئر'' کے زیر اہتمام سید احمد شہیدؒ کی تحریک اور خدمات کے حوالے سے ایک بین الاقوامی سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ سیمینار کا مقصد سید احمد شہیدؒ کی تحریک اور اس کے پس منظر واثرات کے بارے میں گاہی پیدا کرنا اور مستقبل کے منظر نامے میں اس تحریک سے راہنمائی حاصل کرنا تھا۔ راقم کو اس سیمینار میں شرکت کرنے اور ''سید احمد شہیدؒ کی تحریک اور میر نثار علی عرف تیتو میرؒ کی تحریک کا باہمی تعلق'' کے عنوان سے مقالہ پیش کرنے کا موقع ملا جس کے لیے میں اپنے دیرینہ رفیق اور محترم دوست مولانا وقار احمد (لیکچرار اسلامیات خان پور کالج، ہری پور، ناظم دورۂ تفسیر، الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ) کا شکر گزار ہوں کہ یہ قیمتی موقع ان کی اطلاع وتحریض کی وجہ سے حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین بدلہ عطا فرمائیں اور دین ودنیا کی تمام سعادتوں سے بہرہ مند فرمائیں۔

سیمینار کے منتظم ہزارہ یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم کے چیئرمین ڈاکٹر منظور شاہ صاحب تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر پہلے ایک صفحہ پر مشتمل مقالے کا خلاصہ بھیجا گیا جس کا منتظمہ کمیٹی نے جائزہ لیا اور پھر بذریعہ ای میل اطلاع دی گئی کہ آپ مقالہ پیش کرنے آ سکتے ہیں۔ سیمینار تین دنوں پر مشتمل تھا۔ پہلے دو دن مقالات پیش کئے گئے اور تیسرے دن شرکاء کے لئے سید صاحبؒ سے متعلقہ منتخب مقامات کی زیارت اور دیگر سیاحتی مقامات کی سیر کا انتظام کیا گیا تھا۔ پہلے دو دن سیمینار کے دو حصے تھے، صبح نو بجے سے ایک بجے تک کا وقت مہمانان خصوصی کی گفتگو کے لیے مختص تھا جس کو Key Notes کا عنوان دیا گیا تھا اور دوسرے حصے میں مقالہ پیش کرنے والے شرکاء کے لئے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے مختلف کمروں میں متوازی سیشنز میں مقالہ پیش کرنے کا اہتمام تھا۔ جن شرکاء نے مقالہ پیش کیا، ان کی مجموعی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔

سیمینار کا آغاز ڈاکٹر منظور شاہ صاحب کے خوش آمدیدی خطاب سے ہوا۔ جس میں سیمینار کا مقصد بتایا گیا۔ ان کے بعد سیمینار کے مہمان خصوصی پروفیسر ڈاکٹر محمد اشرف عدیل نے بطور کی نوٹ سپیکر خطاب کیا۔ ڈاکٹر اشرف عدیل کا

* لیکچرر شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ ڈگری کالج، ڈسکہ۔ استاذ الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ۔

تعلق یونیورسٹی آف پینسلوینیا، امریکہ سے ہے اور وہ وہاں سے سیمینار میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔ ان کے خطاب کا عنوان ''معاشروں اور تحریکات کی کارکردگی جانچنے میں اعتدال بطور پیمانہ'' تھا۔ انہوں نے قرآن کریم کی آیت مبارکہ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاء عَلَى النَّاس (البقرۃ، ۱۴۳) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اعتدال اس امت کا امتیازی وصف ہے اور اس امت کی اصلاح اسی وصف کو ہر شعبہ زندگی میں اپنانے سے ممکن ہے۔ انہوں نے اس بات پر بطور خاص زور دیا کہ کسی بھی قوم میں انقلاب کی ابتداء کلاس روم سے ہوتی ہے اس لئے ہمیں اپنے تعلیمی نظام کو بہتر اور مؤثر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اسی سے معاشرہ انقلاب سے روشناس ہوگا۔ سوال و جواب میں شرکاء کی طرف سے کافی اہم سوالات اٹھائے جن کا ڈاکٹر صاحب نے عمدگی کے ساتھ جواب دیا۔

keynote speakers میں پہلے دن اسراء یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عمر علی خان، ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان شامل تھے۔ ڈاکٹر عمر علی خان کے مقالے کا عنوان '' The Renaissance of Millat -E - Muslima and Its Resurrection after The Encounter of Balakot'' ۔ یہ مقالہ انگریزی زبان میں بڑے جوشیلے انداز میں پیش کیا گیا۔ لوگوں نے توجہ سے سنا بھی، لیکن ان کے آیات اور احادیث کی غلط تلاوت کی وجہ سے عمومی تاثر اچھا نہیں رہا۔ ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان جو کہ سرحد یونیورسٹی پشاور سے تشریف لائے تھے، ان کے مقالے کا عنوان تھا۔'' The Historical outcome of Armed Struggle by Syed Ahmed Shaheed: A Critical Analysis'' انہوں نے سید صاحبؒ کے سفر اور جدوجہد کی روداد داستان کے انداز میں سنائی۔ اس سیشن کے اختتام پر مانسہرہ کے سابق ضلعی خطیب اور بالاکوٹ میں مدرسہ سید احمد شہیدؒ کے مہتمم قاضی نے اپنے مختصر خطاب میں کہا کہ میری پرزور رائے بلکہ مطالبہ ہے کہ سید احمد شہیدؒ کی خدمات سے عوام الناس کو متعارف کروانے کے لئے ہزارہ یونیورسٹی کو ان کے نام سے موسوم کیا جائے۔ انہوں نے ضیاء دور کے ایک اعلان کا حوالہ بھی دیا جس میں ایک جگہ سید احمد شہیدؒ کے نام سے ایک لائبریری بنانے کا اعلان ہوا تھا اور سنا یہ گیا تھا کہ فنڈز بھی جاری ہو چکے ہیں لیکن آج تک وہ لائبریری معرض وجود میں نہیں آسکی۔ ان کی دعا پر اس سیشن کا اختتام ہوا۔ پہلے دن کے keynote سیشن کے اختتام پر ہمارا تاثر یہ تھا کہ موضوع پر بہت کم بات ہوئی اور وعظ و نصیحت کی محفل زیادہ جمی رہی۔

دوسرے دن keynote والے سیشن میں ڈاکٹر سعید الرحمان اور کراچی سے تشریف لانے والی ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کی گفتگو انتہائی عمدہ اور عین موضوع کے مطابق تھی۔ ڈاکٹر سعید الرحمان (صدر شعبہ اسلامیات، بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان) کے مقالے کا عنوان تھا'' Syed Ahmed Shaheed's Mission of Reforming Muslim Society: Research and Analysis" اپنے Keynote خطاب میں انہوں سید صاحبؒ کے جہاد کی ہمہ گیریت پر نہایت عمدہ گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ عام طور پر سید صاحبؒ کے جہاد کے بارے میں یہ تصور ہے کہ یہ سکھوں کے مقابلے میں ایک مسلح جدوجہد تھی اور بس۔ حالانکہ سید صاحبؒ کے ہاں جہاد کا تصور بڑا وسیع ہے اس میں عوامی بہبود، معاشرتی رسومات کی اصلاح اور عقائد کی درستگی سب شامل ہے اور سید صاحبؒ کے حالات زندگی اس پر

شاہد ہیں۔ گویا اس جہاد سے محض مسلح جدوجہد مراد لیا اس کی وسعت کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے چائے کے وقفہ کے دوران ہم نے ملاقات کی اور درخواست کی کہ کچھ وقت عنایت ہو تو مولانا وقار صاحب کے پی ایچ ڈی کے موضوع مقالہ اور کچھ دیگر امور پر راہنمائی حاصل کی جا سکے۔ انہوں نے سیشن کے دوران وقفہ میں ہم کو بلایا اور حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے حوالے سے پی ایچ ڈی کے موضوعات کے حوالے سے انتہائی مفید راہنمائی فرمائی۔ راقم نے دوران گفتگو سوال کیا کہ کیا مدرسہ کے طلبہ کو مطالعہ کا عادی بنانے کے لئے کوئی ناول دیا جا سکتا ہے جیسے کہ نسیم حجازی کے ناول ہیں تو انہوں نے برملا کہا کہ ایسے ناول انسان کے اندر ایک تخیلاتی دنیا تشکیل دیتے ہیں کہ ایک نجات دہندہ آئے گا اور کشتوں کے پشتے لگا کر قوم کو مصائب سے نجات دلائے گا۔ اس سے پھر وہ ساری زندگی کسی ایسے مسیحا کا انتظار ہی کرتے رہتے ہیں جو کہ ان کی نجات کا سندیسہ لے کر آئے اور یہ کوئی practical approach نہیں۔

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ کی گفتگو بلاشبہ پوری کانفرنس کی جان کہی جا سکتی ہے اور ان کی گفتگو کے بعد سید حنیف رسول صاحب نے اٹھ کر برملا اقرار بھی کیا کہ شکر ہے آپ کی گفتگو ہوئی وگرنہ کل سے سید صاحبؒ کے متعلق کافی کنفیوژن پیدا ہو چکی تھی جس کا اب کافی حد تک ازالہ ہو چکا ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا ''Political Vision of Sayyed Ahmad Shaheed''۔ اپنی گفتگو میں انہوں نے سید صاحبؒ کے حالات سے متعلق تقریباً تمام کتب اور ماخذ کا انتہائی عمدہ اور بھرپور تنقیدی جائزہ پیش کیا اور سید صاحبؒ کی جدوجہد کی عظمت کو اجاگر کیا۔ انہوں نے اپنی گفتگو کا اختتام سید صاحبؒ کے حوالے سے ایک مثال پر کیا کہ دوران جنگ دو سپاہی ایک مورچے میں محصور ہیں، ان کے پاس ایک ہی بم ہے، دوسری طرف سے دشمن مسلسل فائرنگ کر رہا ہے اور گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے، اس دوران ایک سپاہی نے اٹھ کر وہ اکلوتا بم دشمن کی طرف پھینکا۔ اب اگر وہ گولیوں کا نشانہ بننے سے محفوظ رہا تو لوگ اس کو شجاع اور بہادر کہہ کر اس کی تعریف کریں گے اور اگر وہ کسی گولی کا نشانہ بن کر جام شہادت نوش کر گیا تو یہی لوگ تنقید کرتے ہوئے یہ کہنے لگیں گے کہ کیا ضرورت تھی جان گنوانے کی، انتظار کر لیتے، ایسے ہی اپنا بھی نقصان کیا اور قوم کا بھی وغیرہ۔ سید صاحبؒ کے بارے میں بھی ایسا ہی رویہ ہے، سید صاحبؒ وہ سپاہی ہیں جنہوں نے دشمن پر آخری حملہ کیا اور جان کی بازی ہار گئے اور بعد والے لوگ ان کی کوشش کو پس پشت ڈال کر ان پر تنقید کے نشتر چلانے لگے حالانکہ انہوں نے اس وقت کے معروضی حالات کے مطابق اپنا فرض ادا کر دیا۔

دوسرا سیشن ظہر کی نماز کے بعد شروع ہوا، اس میں مقالہ پیش کرنے والے شرکاء نے اپنے مقالہ جات پیش کئے جس کا انتظام شعبہ تعلیم کے کلاس رومز میں کیا گیا تھا۔ چار کمرے منتخب کئے گئے تھے اور ہر کمرے میں تقریباً پانچ سے چھ مقالہ نگاروں نے اپنے مقالہ جات پیش کئے۔ اس طرح دونوں میں تقریباً بیس کے قریب مقالے پیش کئے گئے۔ کانفرنس کے اس حصے میں سید صاحبؒ کی تحریک کے حوالے سے جو نکات زیادہ زیر بحث رہے ان میں سے چند اہم نکات حسب ذیل ہیں:

۱۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک برطانوی ایمپائر کی حکمت عملی کا نتیجہ تھی، اس کی دلیل یہ دی گئی کہ انگریز سامراج نے

سب سے پہلے بنگال کے علاقوں پر قبضہ کیا اور سید احمد شہیدؒ کی تحریک کی تقریباً ساری افرادی قوت انہیں علاقوں سے تعلق رکھتی ہے، سید احمد شہیدؒ کے مریدین کا سب سے بڑا حلقہ بھی انہیں علاقوں میں تھا۔ انگریز ایمپائر کو اس وقت زیر قبضہ علاقوں پر اپنا قبضہ مستحکم کرنے اور مزید علاقوں پر قبضہ کرنے کے لئے جن دو قابل ذکر مزاحمتوں کا سامنا تھا وہ ایک بنگال اور ملحقہ علاقوں میں موجود مسلم مزاحمتی عنصر تھا اور دوسرا پنجاب کے علاقوں میں سکھ راج تھا، انگریزوں نے اپنے زیر قبضہ علاقوں سے یہ ساری قوت مجتمع کر کے سکھوں کے خلاف کھڑی کر دی جس سے جہاں یہ مسلم مزاحمتی قوت تباہ ہو گئی وہیں سکھوں کی قوت کا بھی کافی حد تک توڑ ہو گیا، اس طرح برطانوی ایمپائر نے اپنے دونوں مقاصد حاصل کر لئے ۔اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ یہ ساری تحریک اصل میں برطانوی ایمپائر کی حکمت عملی کا نتیجہ تھی اور جس طرح ہم عصر حاضر میں افغانستان و دیگر علاقوں میں امریکی ایمپائر کے ہاتھوں استعمال ہو رہے ہیں سید صاحبؒ کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ ہوا ۔ یہ نظریہ GPGC, Mansehra سے آئے ہوئے ڈاکٹر ریاض حسین صاحب نے پیش کیا جن کے مقالے کا عنوان تھا ''The Study of jihad Movement Through Imperialist Persperctive''۔

۲۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد اصلاً انگریزوں کے خلاف تھی اور ان کا سکھوں کے ساتھ ٹکرا ان کے مشن کی ایک ناگزیر قسط تھی۔ اس کے دلائل میں سید صاحبؒ کے وہ خطوط پیش کئے گئے جو انہوں نے ہندو راجاؤں کو لکھے جن میں ان کو تعاون کرنے اور اس تعاون کے بدلے میں ان کی راجدھانیاں قائم رہنے کی یقین دہانی کروائی گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ سید صاحبؒ کا اصل ہدف انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا تھا نہ کہ سکھوں یا دوسری اقوام کے ساتھ جنگ چھیڑ دینا۔ اس موقف پر کافی لے دے ہوئی اور عمومی سامعین نے اس کو قبول نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ سید صاحبؒ کے پیش نظر صرف انگریزوں کا اخراج نہیں تھا بلکہ وہ ایک اسلامی ریاست کے قیام اور خلافت علی منہاج النبوت کے احیاء کے لئے نکلے تھے۔ مندرجہ بالا موقف کی نمائندگی سید حنیف رسول نے کی جو Edwards College, Peshawar سے آئے تھے ۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا ''Revisiting Syed Ahmad Shaheed's Tehreek-e-Mujahedeen: First LIberation Movement of the Wali Ullahi School''

۳۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا دو قومی نظریہ سے کیا تعلق ہے؟ اس ضمن میں عام تاثر وہی رہا جو ہمارے معاشرے میں پایا جاتا ہے کہ دو قومی نظریہ شاہ ولی اللہؒ بلکہ ان سے بھی پہلے سے شروع ہوتا ہے اور قیام پاکستان تک پہنچتا ہے۔ اس معاملے میں ایک دلچسپ بحث کانفرنس کے تیسرے دن ٹور کے موقع پر ہوئی۔ ٹور سے واپسی پر ایک جگہ چائے کے لئے رکے تو شرکاء میں دو قومی نظریہ کی تعریف پر بات چلی۔ اسراء یونیورسٹی اسلام آباد سے آئے ہوئے ڈاکٹر ریاض سعید نے کہا کہ دو قومی نظریہ یہ ہے کہ ہندو اور مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں کیوں کہ ان کا مذہب، رسوم و روایات اور طرز زندگی مختلف ہے، اس پر مولانا وقار احمد نے سوال کیا کہ پاکستان میں بسنے والے ہندو اور سکھ پھر کس قومیت سے تعلق رکھتے

ہیں اور ان کے شناختی کارڈ میں قومیت کے خانے میں کیا لکھا ہوتا ہے؟ ان کے سوال پر کچھ دیر کے لئے شرکاء خاموش ہوئے تو درمیان میں راقم نے یہی سوال ہندوستان کے مسلمان باسیوں کے بارے میں اٹھایا تو ایک صاحب کہنے لگے کہ ان کو الگ کرنے کے لئے شناختی کارڈ کے خانے میں مذہب کا خانہ موجود ہے۔ اس پر عرض کیا کہ مذہب کا خانہ موجود ہے لیکن قومیت ''Nationality'' کے خانے میں وہ بھی پاکستانی ہی ہیں یہاں پر دو قومی نظریہ کہا گیا؟ اس پر شرکاء کی طرف سے کوئی تسلی بخش جواب نہ آ سکا۔ ہمارا اصرار تھا کہ قومیت کا جو تصور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے پیش کیا تھا وہ عملی طور پر آج بھی پاکستان سمیت دنیا بھر میں رائج ہے اور یہی عملی طور پر ممکن بھی ہے۔ اور دو قومی نظریہ ایک وقتی ضرورت تو کہا جا سکتا ہے لیکن اس کو عملی طور پر نا قابل عمل ہی سمجھا گیا ہے اور قومیت کے خانے میں آج بھی وطن اور خطہ زمین کی بنیاد پر ہی قومیت درج کی جاتی ہے۔ کافی گرما گرم بحث ہوئی۔ آخر میں ڈاکٹر ریاض صاحب نے یہ کہا کہ اس بحث سے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اس موضوع پر مزید مطالعہ کرنا چاہئے اور انہوں نے مولانا وقار صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ اس بحث کا ایک اہم پہلو سامنے لائے ہیں۔ ان کے مقالہ کا عنوان تھا'' Syed Ahmed Shaheed movement and the two nation's theory(Struggle for a swparate identity in Indian subcontinent)''۔

۴۔ سید صاحبؒ کی تحریک کے عصر حاضر کے ساتھ تعلق پر جو سوال بار بار زیر بحث آیا وہ ان کی تحریک اور طالبان تحریک خصوصاً پاکستانی طالبان کے نظریات کے درمیان مماثلت کا سوال تھا۔ یعنی سید صاحبؒ اگر ہتھیار اٹھا کر ایک خطہ لینا چاہتے ہیں اور اس ضمن میں مسلح کوشش کرتے ہیں تو وہ جہاد کہلاتا ہے اور طالبان اگر یہی کام کرتے ہیں تو وہ دہشت گردی کہلاتی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ گویا طالبان تحریک سید صاحبؒ کی جدوجہد کا ہی ایک تسلسل ہے۔ اس سوال پر کافی محتاط گفتگو ہوئی اور کوئی بات واضح نہ ہو سکی لیکن عام شرکاء کی باڈی لینگوئج سے ایسا احساس ہوتا تھا کہ لوگ اس معاملے میں کنفیوژن کا شکار ہیں اور ان کے ذہنوں میں اس حوالے سے کوئی تسلی بخش تصور نہیں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ سید صاحبؒ کے حوالے سے عقیدت و احترام اور طالبان کے حوالے سے برعکس رویہ دیکھنے میں آیا خصوصاً پاکستانی طالبان کے حوالے سے۔

۵۔ راقم کا مقالہ ''سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد اور میر نثار علی عرف تیتو میر کی تحریک کا باہمی تعلق: تحقیقی مطالعہ'' کے عنوان سے تھا جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ تیتو میر کا تعلق سید صاحبؒ سے ضرور تھا اور انہوں نے ان کے سفر حج سے پہلے یا دوران سفر ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی تھی اور غیر مستند روایت کے مطابق سید صاحبؒ نے ان کو اپنا خلیفہ بھی مقرر کیا تھا لیکن ان کی تحریک کو مزاحمتی تحریک تو کہا جا سکتا ہے جو کہ حالات کے جبر کی وجہ سے ان کو منظم کرنا پڑی لیکن اس کے پیچھے تحریک مجاہدین کا وہ اساسی تصور نہیں تھا کہ قوت جمع کر کے کسی علاقے پر قبضہ کیا جائے اور اسلامی تعلیمات کا نفاذ کیا جائے، بلکہ اپنی ابتداء میں یہ ایک اصلاحی تحریک تھے جس کا مقصد غلط رسوم کا قلع قمع اور مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح کے ساتھ ان کی دینی تعلیم کا مناسب بندوبست کرنا تھا، یہ اصلاحی تحریک کچھ مسلمانوں کی ریشہ دوانیوں اور ہندہ

راجاؤں کے مظالم کی وجہ سے مسلح مزاحمت میں تبدیل ہوگئی۔ ہاں اختتام پر جب تیتو میر شہیدؒ نے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا تو انہوں نے کچھ عرصہ کے لئے اپنی آزاد حیثیت اور برطانوی تسلط و ہندو راجاؤں کی عملداری سے نکل جائے کا اعلان کیا تھا جس کی وجہ سے ان کے خلاف ایک بڑا آپریشن کیا گیا اور وہ اپنے سینکڑوں ساتھیوں سمیت شہید ہوئے۔ ان کی شہادت سید صاحب کی شہادت سے کچھ عرصہ بعد ہوئی ہے۔

۶۔ مولانا وقار صاحب (لیکچرار اسلامیات، گورنمنٹ کالج، خانپور) کے مقالے کا عنوان تھا ''تحریک مجاہدین کی ناکامی کے اسباب و وجوہ: تجزیاتی مطالعہ'' اس میں انہوں نے بڑی تفصیل سے ان وجوہات پر گفتگو کی جن کی وجہ سے سید صاحبؒ کی تحریک بظاہر ناکامی سے دوچار ہوئی۔ اس میں انتظامی امور میں لاپرواہی، علاقائی حالات کے بارے میں غلط اندازے، مقامی لوگوں کا غیر تربیت یافتہ ہونا، گردونواح کے کچھ مسلمانوں کی مفاد پرستی اور کئی دیگر وجوہات پر بات ہوئی جو کہ سید صاحبؒ کی تحریک کی ناکامی کا باعث بنے۔ لوگوں نے انتہائی توجہ سے سنا اور کثیر سوالات کے ذریعے اس میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

ان مقالات کے علاوہ دیگر عنوانات پر بھی گفتگو ہوتی رہی، مثلاً سید صاحبؒ کے بعد ان کی تحریک کا تسلسل کہاں تک رہا اور کس کس نے ان کا مشن جاری رکھنے کی کوشش کی؟ اسی طرح جو لوگ مقتل سے بچ گئے، وہ کس طرف گئے اور ان کی زندگی کی کیا مصروفیات رہیں؟ بہر حال کانفرنس کے دوران بہت اچھا علمی ماحول بن گیا اور شرکاء نے ایک دوسرے کے مطالعہ و معلومات سے بھرپور استفادہ کیا۔ بجا طور پر ہزارہ یونیورسٹی کی انتظامیہ، ہزارہ چیپٹر کے منتظمین اور خصوصاً ڈاکٹر منظور حسین شاہ صاحب اس اہم موضوع پر کامیاب بین الاقوامی کانفرنس کے انعقاد پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کچھ انتظامی خامیاں ضرور رہیں لیکن علمی استفادہ و افادہ خوب ہوا، اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اسی طرح اہم موضوعات پر کانفرنسز اور سیمینارز منعقد کرنے کی توفیق مزید مرحمت فرمائیں۔ آمین بجاہ النبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم۔


# مقالاتِ ایوبی

رشحات قلم: مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی

**چند عنوانات:** o منافع خوری کی حد اسلامی نقطہ نظر سے o عدالتی فسخ نکاح کی شرعی حیثیت o زنا غیر مستوجب حد میں مجرم کو تعزیری سزا o عوامی مفاد کے لیے قبرستان اور مسجد کی جگہ کا استعمال o واقعہ کربلا تاریخ کے آئینے میں o طلبہ کے سوالات و اشکالات اور ارباب مدارس کا رویہ

ناشر: الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ

صفحات: ۲۴۶۔ قیمت: ۲۵۰ روپے